جلد: ۹۴	شعبان - رمضان ۱۴۳۱ھ مطابق اگست ۲۰۱۰ء	شمارہ: ۸

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۵ روپئے، سالانہ -/۱۵۰ روپئے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۰۰۰ روپئے

بنگلہ دیش سے سالانہ -/۵۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۵۰۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman, Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبرشمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	دینی علوم کی عظمت اور فضیلت ...	مولانا حافظ محمد صدیق المیمنی	۶
۳	حجیت حدیث وسنت	حبیب الرحمٰن اعظمی	۱۴
۴	بیس رکعات تراویح اہل سنت والجماعت کی علامت ہے	مولانا محمد شفیع قاسمی، بھٹکلی	۲۸
۵	بچوں کی تربیت کیسے کریں	مولانا میر زاہد مکھیالوی	۳۱
۶	مذہبی آزادی - بقائے باہم کا ایک درخشاں اصول	ریحان اختر	۳۴
۷	علماء کا معاشرے میں کردار	یریداحمد نعمانی	۴۴
۸	تحریک آزادی ہند اور تحریک آزادی فلسطین دونوں میں امتیاز کیوں؟	ڈاکٹر اجمل فاروقی	۴۷
۹	میرے قابل احترام اساتذۂ کرام	مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی	۵۰

- ○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اقتدار کے ابوالہوسوں نے اپنے طور پر یہ باور کرلیا تھا کہ مغلیہ اقتدار کی طرح سرزمین ہند سے اسلام، تعلیمات اسلام اور مسلم تہذیب وثقافت کا بھی جنازہ نکل جائے گا، لیکن علمائے حق کی ایمانی فراست، اور روحانی فرزانگی نے اسلام اور تعلیمات اسلام کی سرمدی تحفظ وبقاء کیلئے سیاست نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام سے ایک نسخۂ کیمیا حاصل کرلیا، وہ ایسی دینی مدارس کا قیام تھا جو حکومت کے ہر ایک اقتدار، اور ارباب حکومت کے ہر ایک احسان سے آزاد رہ کر خالص مذہبی منہاج اور دستور العمل کے مطابق نونہالان ملت کی ساخت وپرداخت کریں۔

ایسے وقت میں جبکہ ہندوستان کا گرانبار تعلیمی نظام غریبوں پر اعلیٰ تعلیم کا دروازہ بند کر دیا تھا، یہ مدارس ان درماندہ بچوں کو اپنی آغوش تربیت میں لے کر انہیں عالم دین اور زعمائے ملت بنا رہے تھے، پورے اذعان ویقین کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی تہذیب ومعاشرت کے جو کچھ آثار آج ہندوستان میں نظر آرہے ہیں تو وہ انہیں مدارس کی برکت ہے، علم دین اور پابندیٔ شریعت کی وہ روشنی جو دیگر ممالک کو نصیب نہیں ہندوستان کو انہیں مدارس کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے، اور جب تک ان مدارس کا نظام ہندوستان میں آزادانہ طور پر باقی ہے، اس روشنی کی ضیاء پاشیوں کو کوئی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی ہے۔

اسلام کے حریفوں کے لئے دینی مدارس کا یہی کردار سوہانِ روح بنا ہوا ہے، اور وہ بجان ودل اس کے درپے ہیں کہ اسلامی تہذیب وثقافت کے ان میناروں کو ارضِ ہند سے کسی طرح نیست ونابود کردیں، چنانچہ ان مدارس کو قومی مجرم ٹھہرانے کی غرض سے ملک گیر پیمانہ پر یہ غوغا مچایا گیا کہ یہ اسلامی مکاتب مدارس دہشت گردی کی تربیت دیتے ہیں اور دہشت گردوں کی محفوظ

پناہ گاہ ہیں، مدراس کے سر اس ناروا تہمت کو تھوپنے کی غرض سے سیکولر اور جمہوری سرکاروں کے اہل کار سرگرم عمل ہوگئے، مدارس کو پابند کیا گیا کہ اپنے طلبہ کی فہرست ماہ بماہ تیار کرکے سرکاری انتظامیہ کے دفاتر میں بھیجنے کا التزام کریں، خفیہ پولیس ان مدرسوں کے گرد چکر کاٹنے لگے، غرضیکہ اپنی جیسی ہر تدبیریں کی گئیں کہ کسی طرح ان کا رشتہ دہشت گردی سے جوڑ دیا جائے، مدارس کے اساتذہ، طلبہ اور انتظامیہ کو سراسیمہ کرنے اور مدارس سے لاتعلق ہوجانے کی ہر امکانی کوشش کی گئی، اپنی اس مہم میں یکسر ناکام ہوجانے کے بعد، ''مرکزی مدرسہ بورڈ'' کا شوشہ چھوڑا گیا، اور انہیں مدارس پر جنہیں کل تک دہشت گردی کی تربیت گاہ بتایا جارہا ہے مدرسہ بورڈ کے عنوان سے دادودہش کا دروازہ کھول دیا گیا، لیکن مدارس نے ان سرکاری ٹکڑوں کے عوض اپنے دینی کردار کا سودا کرنے سے صاف انکار کردیا (الا ماشاء اللہ) تو اب ان مدارس کا قلع قمع کرنے کے لئے ''مفت اور لازمی تعلیم'' کے حق کا قانون جاری کیا گیا ہے۔ اس قانون کے تحت جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ بظاہر بڑا خوش کن اور دل فریب ہے کیونکہ اس قانون کی رو سے چودہ سال سے کم عمر کے تمام بچوں کو تعلیم دلانے کی ذمہ داری خود حکومت نے لے لی ہے، اور ان کے والدین اور سرپرستوں کو اس اہم ترین فریضہ سے سبکدوش کردیا ہے، اس طرح وہ بچے بھی تعلیم یافتہ ہوجائیں گے جن کے سرپرست اپنی مالی زبوں حالی کی بناء پر انہیں تعلیم دلانے سے قاصر تھے۔

لیکن اس مفت اور لازمی تعلیم کے خوش رنگ، دل پسند پردے کے پیچھے جبری تعلیم کا تصور انگڑائیاں لے رہا ہے یعنی حکومت اس قانون کے تحت اپنی مرضی سے اپنی پسند کی تعلیم اپنے منتخب اساتذہ سے بچوں کو دلائے گی، یہ تعلیم کیسی ہوگی اور کیسے افراد کے ذریعہ دلائی جائیگی وہ ظاہر ہے، یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ آج ہمارے اس جمہوری اور سیکولر ملک میں سرکاری وغیر سرکاری ہر شعبہ زندگی میں ایک خاص تہذیب اور کلچر کا غلبہ ہے تو یہ ''مفت اور لازمی تعلیم'' اس غلبہ سے کیسے محفوظ رہ سکتی ہے، ابھی ماضی قریب میں ''وندے ماترم'' وغیرہ کا قضیہ اسی تہذیبی یلغار کا شاخسانہ تھا۔

اس پس منظر میں یہ قانون کسی حال میں بھی مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا۔ عقل و انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ جو تعلیمی ادارے پہلے ہی سے ملک کے آئین وقانون کے تحت مفت اور لازمی تعلیم بچوں کو دے رہے ہیں ان کی تحسین اور ہمت افزائی کی جاتی، لیکن اس کے برخلاف مفت اور لازمی تعلیم کے قانون کے بعض دفعات کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ مکاتب، مدارس، یا پرائیوٹ تعلیم گاہوں کی خدمات کی یکسر نفی کردی گئی ہے بلکہ آیندہ ان کے وجود و بقاء پر بھی سوالیہ نشان

لگادیا گیا ہے، جبکہ یہی وہ مکاتب ومدارس ہیں جو آزادیٔ ملک سے پہلے ہی مفت تعلیم کے نظام کو انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ چلارہے ہیں انہیں مدارس کے ساختہ و پرداختہ آزاد ہند کے پہلے وزیر تعلیم تھے، برصغیر کی علمی وثقافتی اور سیاسی تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ سرسید احمد خاں، مولانا محمد قاسم، حضرت شیخ الہند، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مفتی کفایت اللہ، شیخ الاسلام مولانا مدنی، حافظ محمد ابراہیم سابق کابینی وزیر، مولانا حفظ الرحمٰن وغیرہ انہیں مدارس کے پروردہ تھے، اور آج بھی یہ مدارس اپنے معیار تعلیم وتربیت کے اعتبار سے سرکاری کالجوں وغیرہ پر بدرجہا فوقیت رکھتے ہیں، اگر سرکاری اسکولوں کے سارٹیفکٹوں کی سرکاری اہمیت کی بجائے حقیقی قابلیت اور علمیت کو معیار قرار دے کر مقابلہ کرکے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، آج انہیں مدارس کو بعض داخلی وخارجی اثرات کے تحت مقفل کرنے کی اسکیمیں مرتب کی جارہی ہیں، اور حیرت تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ ''کانگریس پارٹی'' کی سرکردگی میں کیا جارہا ہے جس نے ایک بار نہیں بلکہ متعدد بار زعمائے ملت کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم پر کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں لگائی جائے گی۔ اس یقین دہانی کے تحت جب بھارت کے آئین کی وضع وترتیب ہوئی تو ثقافتی اور تعلیمی حقوق کے تحت دفعہ ۳ (۱) میں صاف لفظوں میں اس بات کا اعلان کیا گیا کہ ''تمام اقلیتوں کو خواہ مذہب کی بناء پر ہوں یا زبان کی، اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا۔

پھر اس بنیادی حق کے تحفظ کیلئے آئین کی دفعہ ۱۳ (۲) میں اس بات کا عہد کیا گیا کہ ''مملکت کوئی ایسا قانون نہ بنائے گی جو اس حصہ سے عطا کئے ہوئے حقوق کو چھین لے یا ان میں کمی کرے، اور کوئی قانون جو اس فقرہ کی خلاف ورزی میں بنایا جائے، خلاف ورزی کی حدتک باطل ہوگا''۔

ان تمام تر عہد وپیمان اور یقین دہانیوں کے باوجود خود کانگریس پارٹی کی زیر قیادت موجودہ حکومت اور کانگریسی وزیر کے ذریعہ آج مدارس کو ملک سے ختم کرنے کی تدبیریں کی جارہی ہیں، لیکن جب تک ''بھارت کا آئین'' باقی ہے اقلیتوں سے ان کے اس حق کو چھینا نہیں جاسکتا ہے اور جو گروہ، جماعت، پارٹی اور حکومت اس آئینی حق کو چھیننے کی کوشش کرے گی بلاشبہ اس کا یہ عمل، قانون وانصاف اور آئین بھارت کے خلاف ہوگا، اور اقلیتیں بالخصوص مسلم اقلیت کسی بھی ایسے فارمولے اور تجویز کو قبول نہیں کریں گی جن سے ان کا یہ بنیادی حق پامال ہوتا ہو۔

مشورے پھر ہورہے ہیں اک نئی تنظیم کے
پھر چمن والوں کے ہاتھوں گلستاں خطرے میں ہے

دینی علوم کی عظمت اور فضیلت

اسلامی تعلیمات کی اخلاقی اور تہذیبی قدریں

از: مولانا حافظ محمد صدیق المیمنی

علم کی فضیلت وعظمت، ترغیب وتاکید مذہب اسلام میں جس بلیغ ودلآویز انداز میں پائی جاتی ہے اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی، تعلیم وتربیت، درس وتدریس تو گویا اس دین برحق کا جزولاینفک ہے، کلام پاک کے تقریباً اٹھتر ہزار الفاظ میں سب سے پہلا لفظ جو پروردگار عالم جل شانہٗ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل فرمایا وہ اِقْرَأْ ہے، یعنی پڑھ، اور قرآن پاک کی چھ ہزار آیتوں میں سب سے پہلے جو پانچ آیتیں نازل فرمائی گئیں ان سے بھی قلم کی اہمیت اور علم کی عظمت ظاہر ہوتی ہے، ارشاد ہے:

اِقْرأ وربك الاكرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم.

یعنی پڑھ اور جان کہ تیرا رب کریم ہے، جس نے علم سکھایا قلم کے ذریعے سکھلایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا۔

گویا وحی الٰہی کے آغاز ہی میں جس چیز کی طرف سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے نوعِ بشر کو توجہ دلائی گئی وہ لکھنا پڑھنا اور تعلیم وتربیت کے جواہر وزیور سے انسانی زندگی کو آراستہ کرنا تھا، یہاں ضمناً اس حقیقت کو واضح کردینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جہاں عام انسانوں کیلئے قلم حصول علم کا ایک دنیوی اور مادی ذریعہ ہے وہاں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور رب العالمین کے درمیان حضرت جبریل امین علیہ السلام ایک نورانی اور ملکوتی واسطہ، یہی وہ ملکوتی واسطہ ہے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حصول علم کے مادی ذرائع سے بے نیاز کردیا، اور آپ کی تعلیم وتربیت براہ راست خود خالق کائنات نے فرمائی، جس کی تشریح کلام پاک میں بایں الفاظ موجود ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالم تَكُنْ تَعْلَمُ.

یعنی اور اتاری اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت اور آپ کو سکھائیں وہ باتیں جو آپ جانتے نہ تھے۔

علم وحکمت اور دین و دانائی کا درجہ اور علم والوں کا رتبہ اسلام میں کس قدر بلند ہے اس کا اندازہ کلام پاک کی مندرجہ ذیل آیات سے ہوتا ہے:

یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا.

یعنی اللہ جسے چاہتا ہے عقل اور دانائی کی باتیں مرحمت فرماتا ہے، اور جسے اللہ عقل اور دانائی کی باتیں بخشتا ہے اسے بہت بڑی نعمت عطا کرتا ہے۔

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ.

اللہ تم میں سے ان لوگوں کے درجے بلند کردے گا جو ایمان لائے، اور جنھوں نے علم حاصل کیا۔

خود حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر اور مختلف پیرایوں میں علم وحکمت کی ترغیب دلائی ہے۔ مثال کے طور پر چند احادیث نبویہؐ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے درج کی جاتی ہیں:

(۱) طلب العلم فریضة علی کل مسلم.

یعنی طلب کرنا علم کا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

(۲) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو شخص علم کی طلب میں نکلا وہ گویا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے وطن واپس لوٹے۔

(۳) ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ایک عالم کی برتری ایک عبادت گذار پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے کسی ادنیٰ شخص پر، اور پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور زمین وآسمان کی ہر شے حتیٰ کہ بلوں کی چیونٹیاں اور سمندروں کی مچھلیاں بھی علم سکھانے والوں کے لئے دعائے خیر کررہی ہیں۔

قرآن حکیم کا نظریۂ تعلیم

مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ اسلام یا قرآن ہم کو تعلیم حاصل کرنے سے روکتا نہیں، بلکہ تعلیم کو ہمارے لئے فرض قرار دیتا ہے، وہ تعلیم کے ذریعے ہم کو صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات کے درجہ پر پہنچانا چاہتا ہے، وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقی علم ثابت کرتا

ہے، اور اس کو بنی نوع انسان کی حقیقی صلاح وفلاح اور کامیابی و بہبودی کا ضامن بتاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ قرآن حقیقی علم ہے، اور دوسرے تمام علوم وفنون معلومات کے درجہ میں ہیں، ان تمام معلومات کو اپنی اپنی استعداد کے مطابق حاصل کرسکتے ہیں، کیونکہ ان سب کے اصول حضرت آدمؑ ہی کے خمیر میں ودیعت کردئے گئے ہیں جیسا کہ کلام پاک کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

وعلم آدم الاسماء کلها.

اور آدم کو اللہ تعالیٰ نے تمام چیزیں بتادیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے بلیغ انداز میں فرمادیا ہے:

الحکمة ضالة المومن فحیث وجدها فهو احق بها.

کہ حکمت کو ایک گم شدہ لال سمجھو جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ علم وحکمت اور صنعت وحرفت کے وہ ذخائر جن کے مالک آج اہل یورپ بنے بیٹھے ہیں ان کے حقیقی وارث تو ہم لوگ ہیں، لیکن اپنی غفلت وجہالت اور اضمحلال وتعطل کے سبب ہم اپنی خصوصیات کے ساتھ اپنے تمام حقوق بھی کھو بیٹھے۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو پھر پسر وارثِ میراث پدر کیوں کر ہو

ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دینی علوم کے علاوہ دنیاوی وعمرانی علوم کا کوئی شعبہ یا پہلو ایسا نہیں ہے جو اہل اسلام کے ہاتھوں فروغ نہ پایا ہو، علم کیمیا، طب، جراحی، ہندسہ، ریاضیات یا ہیئت وفلکیات، طبیعات وحیوانیات ارضیات وحیاتیات، معاشیات واقتصادیات، تاریخ وجغرافیہ اور خدا جانے کتنے بے شمار علوم وفنون اور بیش بہا ایجادات واختراعات کے ایسے ماہر وموجد گذرے ہیں کہ اس دور جدید میں بھی ترقی یافتہ قومیں اپنے جدید سے جدید انکشافات وتحقیقات کے لئے ہمارے آبا واجداد کی تشریحات وتسخیرات کی خوشہ چین اور رہین منت ہیں، جیسا کہ مارگولیتھ، جرجی زیدان، ڈریپر، لیبان، نولڈیکی وغیرہ جیسے شہرۂ آفاق مصنّفین ومؤرخین کی بلند پایہ تصانیف سے پتہ چلتا ہے

غرض فن ہیں جو مایۂ دین ودولت طبیعی، الٰہی، ریاضی وحکمت

طب اور کیمیا، ہندسہ اور ہیئت سیاست، تجارت، عمارت، فلاحت

لگاؤگے کھوج ان کا جاکر جہاں تم

نشاں ان کے قدموں کے پاؤگے واں تم (حالی)

دین و دنیا کا فرق

اہل اسلام کے اس دور ترقی اور موجودہ تہذیب یورپ کے درمیان جو اصولی اور بنیادی فرق معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان کی ترقی کی بنا خدا پرستی اور اطاعات خداوندی پر رکھی گئی تھی اور موجودہ تہذیب و ترقیات کی تہ میں مادہ پرستی، شکم پروری، اور اطاعت نفس کارفرما ہے، ان کا منتہائے مقصد رضائے الٰہی اور خدمت خلق تھا، وہ دنیاوی طاقتوں کی تسخیر احکام الٰہی اور قوانین قرآن کے ماتحت کرتے تھے، وہ کائنات کے ہر ذرہ میں، اور ہر ذرہ کی کائنات میں آیاتِ الٰہیہ کا سراغ لگاتے تھے، انھوں نے دنیا یا دنیا کی کسی چیز کو مقصود بالذات نہیں بنایا، ان کی حکومت و دولت، ان کا جاہ وجلال، ان کے علوم وفنون اسباب و ذرائع تھے معرفت کردگار اور عبادت پروردگار کے بخلاف اس کے مغربی تہذیب وتمدن کی بنیاد چونکہ مادہ پرستی پر رکھی گئی تھی، اس لئے الحاد و دہریت افراد جماعت کے رگ وپے میں سرائت کرگئی ہے، اس قسم کی تہذیب کا لازمی اور قدرتی نتیجہ قوانین فطرت سے جنگ، خالق و مالک سے بغاوت اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

مسلمان جب تک اسلام کی صاف اور سیدھی راہ پر چلتے رہے یعنی احکام الٰہی اور تعلیمات نبوی ﷺ کو اپنے لئے مشعل راہ بنائے رکھا اس وقت تک ظاہری ومعنوی ہر طرح کی سربلندیوں اور سرافرازیوں سے خود بھی مالا مال ہوتے رہے، اور نوع انسان بھی ان کے فیوض وبرکات سے مستفیض ہوتی رہی، جب انھوں نے دین کا دامن چھوڑا تو فضل الٰہی نے ان کا ساتھ چھوڑا، برکتوں اور عزتوں نے ان سے منہ موڑا، اور ان کے علوم وفنون، ان کی زبردست طاقتیں، اور فلک بوس عمارتیں، ان کے جاہ وجلال اور ان کے مال ومنال کچھ کام نہ آئے، ان سے چھین لئے گئے۔

مذکورہ بالا موازنہ سے اہم نتیجہ یہ ہاتھ آیا کہ مسلمانوں کو دین کے بغیر نہ دولت وثروت سرنگوں ہونے سے بچاسکتی ہے، نہ طاقت وحکومت، نہ دین کے ہوتے ہوئے فقر وفاقہ انھیں سربلند ہونے سے روک سکتے ہیں، نہ بے سروسامانی وبے بسی، نہ ہی اکثریت واقلیت کا مسئلہ ان کی راہ میں حائل ہوسکتا ہے۔

نامور اہل علم کا اعتراف

بالفاظ دیگر مسلمانوں کے لئے دارین کی فلاح وبہبودگی، کامیابی وکامرانی کی اگر کوئی چیز حقیقی ضامن اور اصلی ذریعہ بن سکتی ہے تو وہ صرف اسلام ہے، جو نہ صرف مسلمانوں ہی کیلئے بلکہ ان کے

ذریعہ ساری انسانیت کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں بہترین رہبر اور مکمل دستور حیات بننے کی صلاحیت رکھتا ہے جیسا کہ ہر ملک و مذہب کے ہر زمان و ہر زبان کے بڑے بڑے ناموراور انصاف پسند مدبروں اور مؤرخوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، اور آئے دن کرتے رہتے ہیں، اقوام عالم کی ممتاز ہستیاں اسلام کی زندہ وجاوید تعلیمات کو فطرت انسانی کے مطابق بتاتی رہیں، اور جس ایمان افروز انداز میں اسلام کے اصولوں کو خراج تحسین ادا کرتی رہی ہیں ان سے کتابوں کی کتابیں بھری پڑی ہیں، مثال کے طور پر یہاں چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، ممتاز روسی فیلسوف کاؤنٹ ٹالسٹائی اپنی کتاب ''دی لائٹ آف ریلیجن'' میں ایک جگہ رقمطراز ہے۔

''قرآن مسلمانوں کی ایک مذہبی کتاب ہے، جس کی نسبت ان کا یہ خیال ہے کہ اس کو خدا نے نازل کیا ہے، یہ کتاب عالِم انسانی کی رہنمائی کے لئے ایک بہترین رہبر ہے، اس میں تہذیب ہے شائستگی ہے، تمدن ہے، معاشرت ہے، اور اخلاقی اصلاح کے لئے ہدایت ہے، اگر صرف یہی کتاب دنیا کے سامنے ہوتی اور کوئی ریفارمر (مصلح) پیدا نہ ہوتا تو یہ عالم انسانی کی رہنمائی کے لئے کافی تھی، ان فائدوں کے ساتھ ہی جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ یہ کتاب ایسے وقت میں دنیا کے سامنے پیش کی گئی جبکہ ہر طرف آتش فساد کے شرارے بلند تھے، خون ریزی اور قتل وغارتگری کا دور دورہ تھا، اور فحش کاری عام تھی، تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ اس مقدس کتاب نے معجزانہ طور پر ان تمام گمراہیوں کا خاتمہ کردیا۔''

یہ حیرت دوچند ہوجاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نبی امیؐ نے عرب جیسی جاہل مطلق قوم کو زمین کے تہ خانوں سے نکال کر فلک الافلاک پر پہنچادیا، عرب کے خانہ بدوش چرواہوں کے سر پر دنیا کی بادشاہت کا تاج رکھ دیا، اور یاد رہے کہ یہ عظیم الشان انقلاب کل ۲۳ سال کی مختصر سی مدت میں کر دکھایا، اوران ہی قرآنی تعلیمات کے زیر اثر عالم اسلام میں ایسی جلیل القدر شخصیتیں اور الوالعزم ہستیاں رونما ہوئیں کہ دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایسی عدیم النظیر مثالیں پیش کی ہیں نہ قیامت تک پیش کرسکتی ہے۔عرب کے ریگستان سے نکل کر عرب کے شتربان دیکھتے ہی دیکھتے اقصائے عالم میں پھیل گئے، اور جہاں کہیں پہنچے وہاں قرآن کے نور ہدایت اور علم وحکمت سے اس خطہ کو اور اس آبادی کو منور کردیا، علوم وفنون کی بڑی بڑی درسگاہیں قائم کیں، بڑے بڑے متمدن شہر آباد کئے، جن کی ترقی وعروج کی یہ شان تھی کہ آج جس طرح طلبہ ممالک یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے جاتے ہیں کسی زمانے میں ممالک یورپ سے بلاد اسلامیہ کی طرف علم وحکمت کے

موتیوں سے اپنے دامن مراد بھرنے کے لئے آتے تھے۔

مسٹر اسٹینلی لین پول اپنی تصنیف ''گارڈنس آف ہولی قرآن'' میں کس بصیرت افروز اور فصیح انداز میں اظہار ضمیر کررہے ہیں:

''قرآن کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسے نازک وقت میں دنیا کے سامنے پیش فرمایا جبکہ ہر طرف تاریکی وجہالت کی حکمرانی تھی، اخلاق انسانی کا جنازہ نکل چکا تھا، اور بت پرستی کا ہر طرف زور تھا، قرآن نے ان تمام گمراہیوں کو مٹایا، جو دنیا پر کئی صدیوں سے چھائی ہوئی تھیں، قرآن نے دنیا کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی، دینیات کے اصول اور علوم وحقائق سکھائے، ظالموں کو رحم دل اور وحشیوں کو پرہیزگار بنایا، اگر یہ کتاب شائع نہ ہوتی تو انسانی اخلاق تباہ ہوجاتے، اور دنیا کے باشندے برائے نام ہی انسان رہ جاتے۔''

غیرقوموں کے مفکرین دین اسلام کے گہرے اور سنجیدہ مطالعہ کے بعد مسلمانوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ خدارا وہ اسلامی اصولوں کے آئینہ دار بن کر زندگی کے میدان میں آئیں، اور بے چین وپریشان حال انسانیت کے لئے عالمگیر امن وسکون کا، راست بازی وصداقت کا، اور اخلاص وہمدردی کا خدائی پیغام پہنچائیں۔

اپنے ہی وطن کے ایک مایۂ ناز اور صلح جو سپوت مسٹر جے پرکاش نرائن کس یقین اور درد بھرے انداز میں فرماتے ہیں:

''اگر آج بھی دنیا بھر کے مسلمان غفلت کے پردے چاک کرکے کھلے میدان میں آئیں اور اسلام کے اصولوں پر عمل کریں تو ساری دنیا کا مذہب اسلام ہوسکتا ہے، صحرائے عرب میں جو ہیرا چمکا تھا اس نے نگاہوں کو خیرہ کردیا تھا، آج اس کے چمکتے دمکتے اصولوں پر گرد وغبار جم گیا ہے اگر اس گرد وغبار کو دور کردیا جائے تو وہ اپنی چمک سے سارے عالم کو مسحور کرسکتا ہے، اور ساری دنیا اس کے سامنے اپنی آنکھیں بچھا سکتی ہے۔''

اور وہ حقیقی اسلام جس کی آج ساری دنیا متلاشی اور محتاج ہے وہ اگر کہیں موجود ہے تو قرآن کریم میں، احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں، سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں، اور اصحاب کرام کی پاک زندگیوں میں، لہٰذا اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان قرآن کریم کو سمجھیں، اور اس پر عمل کریں، احادیث نبویہؐ کا بغور مطالعہ کریں، سیرت طیبہ سے مستفیض ہوں، اور اصحاب کرام کی پاک زندگیوں کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔

دینی تعلیم اور مذہبی فہم

ظاہر ہے کہ دینی تعلیم کا مناسب انتظام اور اہتمام کیئے بغیر دین کا ذوق اور دین کا فہم پیدا ہونا ناممکن ہے، اس لئے ہمارا اولین فرض ہے کہ آنے والی نسل کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لئے کوئی ایسا معقول نظام تعلیم مرتب کریں کہ جس کے ماتحت ہم اپنے بچوں کو مخصوص اوقات میں خالص دینی تعلیم دلاسکیں۔

اسلامی تعلیمات کی تہذیبی قدریں

مجھے یقین ہے کہ اگر موجودہ حالات کی روشنی میں قوم دینی تعلیم کے اہم ترین تقاضے کو صحیح جذبے کے ساتھ حل کرنے میں کامیاب ہوگئی تو آئندہ نسل خالق ومخلوق کے حقوق صحیح طور پر ادا کرنے کے قابل ہو جائے گی، اور اس اعتبار سے دیانتدار امن پسند شہری اور ملک وسماج کی مخلص، دردمند اور خیر خواہ بن جائیگی، اسلئے کہ اسلام جو باتیں اسے سکھلائے گا وہ اس نوعیت کی ہوں گی:

(۱) کوئی مسلمان انسانی برادری کے کسی شخص کا دل اس کے مخصوص مذہب یا خیال کی توہین کرکے نہیں دکھا سکتا، اور نہ ضد میں کوئی ایسا کام کرسکتا ہے جو انصاف سے دور ہو، کیونکہ کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ (مائدہ)
> کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کو ہاتھ سے دیدو، تمہیں ہر حال میں انصاف ہی کرنا چاہئے یہی بات پرہیزگاری سے قریب ہے۔

(۲) انسانی برادری کا کوئی شخص اگر پڑوس میں رہتا ہو تو پڑوسی ہونے کے اعتبار سے اس کا وہی حق ہے جو کسی مسلمان کا حق ہے۔

(۳) ہر انسان ہمدردی اور رحم کا مستحق ہے، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا''۔

(۴) صدقہ وخیرات میں (زکوٰۃ کے علاوہ) مسلمانوں کے علاوہ انسانی برادری کا ہر شخص حقدار ہے، بشرطیکہ وہ امداد کا مستحق ہو۔

(۵) عقائد اور عبادات کے بعد اسلام میں اخلاق کی بے حد اہمیت ہے، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے اخیارکم احسنکم اخلاقاً. تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے

اچھے ہوں۔

(۶) ایک اور موقع پر فرمایا:

''(قیامت کی) ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی کہ حسن اخلاق والا اپنے حسن خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کرسکتا ہے۔'' (ترمذی)

(۷) ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کسی بندہ کا ایمان پورا نہیں ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے، یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں، اگرچہ وہ حق ہی پر کیوں نہ ہو۔''

(۸) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں''

جس سے دیانتداری اور امانت کی جو بے حد اہمیت اسلام میں ہے وہ ظاہر ہوتی ہے، حدیث شریف میں صاف صاف نظر آتا ہے کہ اصلی مسلمان وہی ہے جو اپنے تمام معاملات میں سچا ہو، ایمان دار ہو، امانت دار ہو اور وعدے کا پکا ہو۔

(۹) نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''ہر دین کا ایک خاص خلق ہوتا ہے، اور اسلام کا خاص خلق جہاد ہے۔''

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا: ''حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔''

''مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے، نہ لعنت بھیجتا ہے، نہ بدزبانی کرتا ہے، اور نہ گالیاں بکتا ہے۔'' (حدیث)

ان کے علاوہ جن برائیوں کو دور کرنے کی ہدایات ہمیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول پاکؐ کی احادیث میں ملتی ہیں، ان میں سے کچھ بہت اہم برائیاں یہ ہیں:

''جھوٹ، وعدہ خلافی، دغابازی، تہمت لگانا، خوشامد کرنا، کنجوسی، لالچ، بے ایمانی، چوری، ناپ تول میں کمی، رشوت لینا، اور دینا، سود لینا، اور دینا، شراب پینا، غصہ کرنا، کسی کو دیکھ کر جلنا، اترانا، دکھاوے کے لئے کام کرنا، فضول خرچی وغیرہ۔''

مومن کی زندگی ان جیسے تمام عیبوں سے بالکل پاک ہونا چاہئے، مومن دنیا میں نیکی کا پیامی ہے، نیکی پھیلانا اور برائی مٹانا اس کا کام ہے، اگر خود اس کے دامن میں بداخلاقی کی گندگیاں لگی ہوئی ہوں تو وہ برائی سے جنگ کرنے کے لئے اللہ کا سپاہی کیسے بن سکے گا، اسی طرح زندگی کے ہر ہر شعبہ کے لئے پاکیزہ تعلیمات اسلام میں پائی جاتی ہیں۔

حجیت حدیث وسنت

از: حبیب الرحمٰن اعظمی

کتاب وسنت یعنی قرآن وحدیث ہمارے دین ومذہب کی اولین اساس وبنیاد ہیں، پھر ان میں کتاب الٰہی اصل اصول ہے اوراحادیث رسول اس کی تبیان وتفسیر ہیں۔ خدائے علیم وخبیر کا ارشاد ہے ”وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ“ (الآیة) اورہم نے اتارا آپ کی طرف قرآن؛ تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اسے خوب واضح کردیں۔

فرمان الٰہی سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا مقصد عظیم قرآن محکم کے معانی ومراد کا بیان اور وضاحت ہے، آپ ﷺ نے اس فرض کو اپنے قول وفعل وغیرہ سے کس طور پر پورا فرمایا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اسے ایک مختصر مگر انتہائی بلیغ جملہ میں یوں بیان کیا ہے ”کان خلقه القرآن“ یعنی آپ کی برگزیدہ ہستی مجسم قرآن تھی، لہٰذا اگر قرآن حجت ہے (اور بلاریب وشک حجت ہے) تو پھر اس میں بھی کوئی تردد وشبہ نہیں ہے کہ اس کا بیان بھی حجت ہوگا، آپ نے جو بھی کہا ہے، جو بھی کیا ہے، وہ حق ہے، دین ہے، ہدایت ہے، اور نیکی ہی نیکی ہے، اس لئے آپ کی زندگی جو مکمل تفسیر کلام ربانی ہے آنکھ بند کرکے قابل اتباع ہے ”لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِی رَسُولِ اللّٰہِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ“ خدا کا رسول تمہارے لئے بہترین نمونہٴ عمل ہے، علاوہ ازیں آپ ﷺ کو خدائے علی وعزیز کی بارگاہ بے نہایت سے رفعت وبلندی کا وہ مقام بلند نصیب ہے کہ ساری رفعتیں اس کے آگے سرنگوں ہیں حتی کہ آپ کے چشم وابرو کے اشارے پر بغیر کسی تردد وتوقف کے اپنی مرضی سے دستبردار ہوجانا معیار ایمان واسلام ٹھہرایا گیا ہے۔ وَمَا کَانَ لمؤمنٍ وَلَا مُومِنَةٍ اذا قَضی اللّٰہُ ورَسُولُه اَمْرًا ان یکون لھم الخِیَرَة من امرھم کسی مومن مرد وعورت کو گنجائش نہیں ہے جب اللہ اوراس کا رسول کوئی حکم دے تو پھر ان کے لئے اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے۔ ربّ علیم وعزیز کی ان واضح ہدایات کے بعد بھی کیا کسی کو یہ حق پہنچ سکتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال میں اپنی جانب سے تقسیم وتفریق کرے کہ یہ ہمارے لئے حجت ہے، اور یہ حجت نہیں ہے۔

نیز رسولِ خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

الا انی اُوتیت الکتاب ومثله معهٗ الا یوشِكُ رجلٌ شَبعَانُ علی اریکته یقول: علیکم بهذا القرآن، فما وجدتم فیه من حلال فاحلّوه، وما وجدتم فیه من حرام فحرّموه، الا لا یحلّ لکم الحمار الاهلی، ولا ذی ناب من السبع، ولا کل ذی مِخلب من الطیر" الحدیث (رواه ابوداؤد في السنن في کتاب السنة والاطعمة)(۱)

بغور سنو! مجھے اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرآن دیا گیا ہے، اور قرآن کے ساتھ قرآن ہی جیسی (یعنی حدیث وسنت بھی) دی گئی ہے، خبردار رہو! قریب ہے کہ کوئی آسودہ حال شخص اپنی آراستہ سیج پر بیٹھا کہے گا، اسی قرآن کو لازم پکڑو پس جو چیز اس میں از قبیل حلال پاؤ اسے حلال جانو، اور جو اس میں از قبیل حرام پاؤ اسے حرام جانو، خبردار تمہارے لئے گھریلو گدھا حلال نہیں ہے اور نہ ہی شکاری درندہ اور نہ ہی شکاری پرندہ حلال ہے (حالانکہ صراحت سے ان جانوروں کے حرام ہونے کا ذکر قرآن میں نہیں ہے)

اس حدیث سے درج ذیل امور معلوم ہوئے:

(الف) قرآن ہی کی طرح احادیث بھی منجانب اللہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دی گئی ہیں، (ب) قرآن کی طرح احادیث بھی احکام میں حجت ہیں، (ج) اور قرآن ہی کی طرح ان کی اتباع اور ان پر عمل لازم ہے۔

قرآن وحدیث کی ان تصریحات کے مطابق حضرات صحابہ، تابعین، محدثین، فقہائے مجتہدین اور تمام علماء اہل سنت والجماعت حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حجیت اور اس کی تشریعی حیثیت پر بصیرت کے ساتھ یقین رکھتے ہیں، اہل اسلام کے کسی گروہ، یا فرد نے جب کبھی بھی حدیث پاک کی اس شرعی حیثیت پر ردوقدح کی ہے تو اسے یکسر مسترد کردیا گیا ہے۔

غرضیکہ علماء حق کا یہی جادۂ متوارثہ ہے۔ اپنے تمام اساتذہ کو بھی اسی موقف پر پایا، اور اب تک اس موضوع پر جن کتابوں کے مطالعہ کی توفیق ملی وہ تقریباً ایک درجن سے زائد ہیں ان میں صرف فرقہ قرآنیہ کے بعض مصنّفین کی دو ایک کتابوں کے علاوہ سب میں قابل قبول قوی دلائل

---

(۱) یہ حدیث بہت سی کتب حدیث میں بایں الفاظ مروی ہے:

عن المقدام بن معدی کرب الکندی، انّ رسول الله صلی الله علیه وسلم حرّم اشیاء یوم خیبر: الحمارَ وغیره ثم قال: یوشك الرجل متکئاً علی اریکته یُحدَّث بحدیثی فیقول بیننا وبینکم کتاب الله ما وجدنا فیه من حلال استحللناه وما وجدنا فیه من حرام حرمناه، الا وان ما حرّم رسول الله فهو مثل ما حرّم الله (سنن الدارمی باب السنة قاضیة علی کتاب الله ج:۱، ص:۱۵۲)

کے ساتھ حجیت حدیث کے مذہب منصور کا اثبات اور تائید وتوثیق کی گئی ہے۔ بایں ہمہ ایک ہم عصر مشہور فاضل نے جو اپنی وسیع علمی خدمات کی بناء پر اوساط علمیہ میں اعتبار واستحسان کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اپنی ایک تحریر میں اس بارے میں میرے علم کے مطابق سب سے الگ ایک جدید نقطۂ نظر پیش کیا ہے جو انھیں کے الفاظ میں یہ ہے کہ ''حدیث اور سنت میں فرق (ہے) اور حجت سنت ہے حدیث نہیں'' زیر نظر تحریر میں اسی نقطۂ نظر کا اپنے علم وفہم کے مطابق جائزہ لیا گیا ہے۔
والله هو الملهم الصواب والسداد، وعليه التكلان والاعتماد.

(الف) سنت کا لغوی معنی

۱- امام لغت مطرزی متوفی ۶۱۰ھ ''لفظ سنن'' کے تحت لکھتے ہیں:

"السنة" الطريقه ومنها الحديث في مجوس هَجَر "سنّوا بهم سنّة اهل الكتاب" اى اسلكوا بهم طريقهم يعنى عاملوهم معاملة هؤلاء في اعطاء الامان باخذ الجزية منهم. (المغرب، ج:۱،ص:۴۱۷)

''سنت'' طریقہ کے معنی میں ہے اسی معنی میں مجوس ہجر کے بارے میں حدیث ہے "سنّوا بهم سنة اهل الكتاب" ان مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب جیسا طریقہ اختیار کرو یعنی جزیہ لے کر امن دینے کا جو معاملہ اہل کتاب کے ساتھ کرتے ہو یہی معاملہ ان مجوسیوں کے ساتھ کرو۔

۲- امام محی الدین ابوزکریا نووی متوفی ۶۷۶ھ لفظ ''السنۃ'' کے تحت رقمطراز ہیں:

"سنة النبي صلى الله عليه وسلم أصلها الطريقه، وتطلق سنته صلى الله عليه على الأحاديث المروية عنه صلى الله عليه وسلم، وتطلق السنة على المندوب، قال جماعة من أصحابنا في أصول الفقه: السنة، والمندوب، والتطوع، والنفل، والمرغب، والمستحب كلها بمعنى واحد وهو ما كان فعله راجحاً على تركه ولا إثم على تركه" (تہذیب الاسماء واللغات، ج:۳،ص:۱۵۶)

سنت کا اصل معنی طریقہ ہے اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ اصطلاحاً رسول اللہ ﷺ سے مروی احادیث پر بولا جاتا ہے نیز سنت کا اطلاق امر مستحب پر بھی ہوتا ہے ہمارے شوافع فقہائے اصول کی ایک جماعت کا قول ہے کہ سنت، مندوب، تطوع، نفل، مرغّب، اور مستحب یہ سب الفاظ ایک معنی میں ہیں یعنی وہ فعل جس کا کرنا نہ کرنے پر راجح ہے اور اسے چھوڑ دینے پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

۳- ماہرلغت ابن المنظور متوفی ۷۱۱ھ اپنی گرانقدر تصنیف ''لسان العرب'' میں لکھتے ہیں:

وقد تكرر في الحديث ذكر السنة وما تصرّف منها، والأصل فيه الطريقة، والسيرة، واذا اطلقت في الشرع فإنما يراد بها ما أمر به النبي صلى الله عليه وسلم ونهى عنه وندب إليه قولاً وفعلاً مما لم ينطق به الكتاب العزيز ولهذا يقال في أدلة الشرع الكتاب والسنة أي القرآن والحديث (فصل السین حرف النون، ج:۱۷،ص:۸۹)

سنت اوراس کے مشتقات کا ذکر حدیث میں بار بار آیا ہے، اس کا اصل معنی طریقہ اور چال چلن کے ہے، اور شرع میں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ کام لیا جاتا ہے جس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا، یا جس سے منع کیا، یا جس کی اپنے قول وفعل کے ذریعہ دعوت دی جن کے بارے میں کتاب عزیز نے (صراحت) سے کچھ نہیں کہا ہے، اسی بناء پر دلائل شرعیہ (کے بیان) میں کہا جاتا ہے ''الكتاب والسنة'' یعنی ''قرآن وحدیث''۔

علامہ ابن المنظور کے کلام میں ''ما أمر به النبي صلى الله عليه وسلم ونهى عنه'' عام ہے جس میں امر وجوبی، وغیر وجوبی اور نہی تحریمی وغیر تحریمی سب داخل ہوں گی۔

۴- المعجم الوسیط مادہ سنن میں ہے:

السَّنَن' الطريقة والمثال يقال بنوا بيوتهم على سنن واحد... والسنة الطريقة والسيرة حميدة كانت او ذميمة، وسنة الله حكمه في خليقته، وسنة النبي صلى الله عليه وسلم: ما ينسب إليه من قول او فعل او تقرير، ''وفي الشرع'' العمل المحمود في الدين مما ليس فرضاً ولا واجباً'' (ص:۴۵۶)

سنن طریقہ اور مثال کے معنی میں ہے اسی معنی میں بولا جاتا ہے ''بنوا بيوتهم على سنن واحد'' یعنی اپنے گھروں کو ایک طریقہ اور ایک نمونہ پر بنایا... اور سنت بمعنی طریقہ اور طرز زندگی ہے یہ طریقہ خواہ محمود ہو یا مذموم، اور ''سنت اللہ'' کا معنی اللہ کا اپنی مخلوق کے متعلق فیصلہ کے ہیں، اور سنت رسول سے مراد وہ قول وفعل اور تقریر ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہیں، اور فقہ میں یہ لفظ دین میں اس پسندیدہ عمل پر بولا جاتا ہے جو فرض واجب نہیں ہیں۔

(ب) حدیث کا لغوی معنی

۱- لسان العرب میں ہے:

الحديث نقيض القديم... والحديث كون الشيء لم يكن، ... والحديث

الجديد من الاشياء، والحديث الخبر يأتي على القليل والكثير والجمع أحاديث (ج:۲،ص:۴۳۶ و۴۳۸ فصل الحا، حرف الثاء)

حدیث قدیم کا نقیض (یعنی مقابل مخالف) ہے، حدیث شئ کا ہوجانا جو پہلے نہیں تھی، بمعنی جدید اور نئی، بمعنی خبر خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر، اور جمع احادیث ہے۔

۲- ابن سیدہ متوفی ۴۵۸ھ المخصص میں لکھتے ہیں:

الحديث الخبر، وقال سيبويه: والجمع أحاديث. (ج:۳،ص:۳۲۳)

حدیث کے معنی خبر کے ہیں اور سیبویہ نے کہا ہے کہ اس کی جمع احادیث ہے۔

۳- علامہ قاضی محمد اعلیٰ تھانوی متوفی ۱۱۹۱ھ کشاف اصطلاحات الفنون میں لکھتے ہیں:

الحديث لغة ضد القديم ويستعمل في قليل الكلام و كثيره (۲۷۹)

حدیث قدیم کا ضد ہے، اور کلام قلیل وکثیر میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

۴- علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۳ھ لکھتے ہیں:

كل كلام يبلغ الإنسانَ من جهة السمع او الوحي في يقظته أو منامه يقال له حديث. قال عزّ وجلّ: "وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلى بَعْضِ اَزْوَاجِهِ حديثًا (التحریم:۳، مفردات الفاظ القرآن، ص:۱۲۴)

ہر وہ کلام جو انسان تک پہنچتا ہے کان کی جانب سے یا وحی کی جانب سے بیداری یا خواب کی حالت میں اسے حدیث کہا جاتا ہے۔ اللہ عزّ وجلّ کا ارشاد ہے: واذ اَسرّ النبیّ" الآیة اور جب کہ کہی نبی نے اپنی بعض بیوی سے ایک بات۔

علمائے لغت کی مندرجہ بالا عبارتوں سے معلوم ہوا کہ ''حدیث'' از روئے لغت، جدید، غیر موجود کا وجود میں آجانا، خبر اور کلام یعنی بات کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

سنت وحدیث کی اس لغوی معنوی تحقیق کے بعد ان ہر دو کی اصطلاحی تعریف ملاحظہ کیجئے، جس کے تحت علمائے حدیث، علمائے اصول فقہ، اور فقہ حنفی کی الگ الگ تعریفات نقل کی جارہی ہیں؛ تاکہ مسئلہ زیر بحث میں ہر جماعت وطبقہ کی اصطلاحات سامنے رہیں اور خلط مبحث سے بچا جاسکے۔ سب سے پہلے حدیث کی تعریف محدثین کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

حدیث محدثین کی اصطلاح میں

شیخ ابوالفیض محمد بن محمد فارسی حنفی المعروف بہ فصیح ہروی متوفی ۸۳۷ھ اپنی مفید تصنیف

جواہرالاصول میں حدیث کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

۱- "الحديث، وهو في اللغة ضد القديم، ويستعمل في قليل الكلام و كثيره، وفي اصطلاحهم: قول رسول الله صلى الله عليه وسلم وحكاية فعله وتقريره والسنة ترادفه عندهم" (ص:۱۰)

لغت میں حدیث قدیم کا ضد ہے، اور تھوڑی وزیادہ بات پر بھی حدیث کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اور محدثین کی اصطلاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور آپ ﷺ کے فعل وتقریر کی حکایت وبیان حدیث ہے، ان حضرات کے نزدیک سنت، حدیث کے مرادف ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ صحیح بخاری کے باب الحرص علی الحدیث کے تحت لکھتے ہیں:

۲ - "المراد بالحديث في عرف الشرع ما يضاف إلى النبي صلى الله عليه وسلم و كأنّه أريد به مقابلة القرآن لأنه قديم" (فتح الباری، ج:۱،ص:۲۵۷)

حدیث سے مراد شرعی ودینی عرف واصطلاح میں وہ امور ہیں، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہیں، "ما يضاف إلى النبیؐ" میں حافظ عسقلانیؒ نے جس عموم کی جانب اشارہ کیا تھا، ان کے تلمیذ رشید حافظ سخاوی نے اپنی ذکر کردہ تعریف میں اسی کی تشریح وتوضیح کی ہے۔ ''واللہ اعلم''

۳-حافظ سخاوی متوفی ۹۰۲ھ ''حدیث'' کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں:

"الحديث" لغة ضد القديم، واصطلاحاً: ما أضيف إلى النبي صلى الله عليه وسلم قولاً له أو فعلاً، أو تقريرًا أو صفةً حتى الحركات والسكنات في اليقظة والمنام، فهو أعمّ من السنة... وكثيراً ما يقع في كلام أهل الحديث - ومنهم الناظم - ما يدل لترادفهما" (فتح المغیث، ج:۱،ص:۹)

حدیث لغت میں حادث ونوپید کے معنی میں ہے اور اصطلاح محدثین میں حدیث وہ سب چیزیں ہیں جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب منسوب ہیں (یعنی) آپ ﷺ کا قول، یا فعل، یا آپ کا کسی امر کو ثابت اور برقرار رکھنا، یا آپ کی صفات؛ حتی کہ بیداری اور نیند میں آپ کی حرکت وسکون (یہ سب حدیث ہیں لہٰذا اس تعریف کی رو سے یہ سنت سے عام ہے، (جبکہ) علمائے حدیث (جن میں ناظم یعنی الفیۃ الحدیث کے مصنف حافظ عراقی متوفی ۸۰۶ھ بھی ہیں) کا کلام کثرت سے یوں واقع ہوا ہے، جو حدیث وسنت کے ترادف اور ایک ہونے کو بتا رہا ہے۔

نادرۂ روزگار علامہ عبدالحئیؒ فرنگی محلیؒ متوفی ۱۳۰۴ھ حدیث کی تعریف پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۴ – واختلف عباراتهم في تفسير الحديث، فقال بعضهم: ما أضيف إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم قولاً أو فعلاً أو تقريرًا، أو إلى الصحابي، أو إلى التابعي، وحينئذ فهو مرادف السنة، وكثيرا ما يقع في كلام الحفاظ ما يدل على الترادف. وزاد بعضهم أو صفة، وقيل رُوياء أيضاً بل الحركات والسكنات النبوية في المنام واليقظة أيضاً، وعلى هذا فهو أعم من السنة (ظفر الامانی مع تعلیق علامہ شیخ ابوغدہ، ص:۲۴)

حدیث کی تفسیر وتعریف میں حضرات محدثین کی عبارتیں مختلف ہیں، بعض محدثین یوں تعریف کرتے ہیں وہ قول یا فعل یا تقریر جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہیں یا صحابی یا تابعی کی طرف ان کی نسبت ہے (وہ حدیث ہے) اس تعریف کی رو سے حدیث، سنت کے مرادف ہوگی اور حفاظ حدیث کے بکثرت کلام وتصرفات دونوں کے مرادف ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

اور بعض محدثین نے حدیث کی تعریف میں آنحضرت ﷺ کی صفات، اور خوابوں کا بھی؛ بلکہ بحالت نوم یا بیداری آپ کے حرکات وسکنات کا اضافہ کیا ہے؛ لہٰذا ان کی تعریف کے لحاظ سے حدیث میں سنت کے اعتبار سے وسعت وعمومیت ہوگی۔

سنت محدثین کی اصطلاح میں

حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ فتح الباری میں لکھتے ہیں:

۱ – والمراد "بالكتاب" القرآن المتعبد بتلاوته، و"بالسنة" ما جاء عن النبي ﷺ من أقواله وأفعاله وتقريره وما هَمَّ بفعله، والسنة في أهل اللغة الطريقة وفي اصطلاح الأصوليين والمحدثين ما تقدم. (کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ج:۱۳، ص:۳۰۶)

''الکتاب'' سے مراد قرآن ہے جس کی تلاوت کو عبادت گذاری ٹھہرایا گیا ہے، اور ''السنۃ'' سے مراد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال، افعال، تقریر اور وہ چیزیں ہیں جن کے کرنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصد وارادہ فرمایا، اور سنت اصل لغت میں طریقہ کے معنی میں ہے اور علمائے اصول اور علمائے حدیث کی اصطلاح میں یہی ہے جس کا اوپر بیان ہوا۔

حافظ عسقلانیؒ کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ حضرات محدثین اور اصولیین سنت کے

اصطلاحی معنی میں متفق ہیں۔

۲- علامہ بدرالدین عینی متوفی ۸۵۵ھ نے بھی بعینہٖ انہی الفاظ میں سنت کی تعریف ذکر کی ہے (دیکھئے عمدۃ القاری، ج:۲۵، ص:۲۳ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ کی ابتدائی سطور)

۳- حافظ السخاوی متوفی ۹۰۲ھ نے اپنی نہایت مفید ومحققانہ تصنیف "فتح المغيث بشرح ألفية الحديث للعراقي" میں سنت کی تعریف یہ کی ہے "السنن المضافة للنبي صلى الله عليه وسلم قولاً له أو فعلاً أو تقريرًا، وكذا وصفًا وأيامًا" (ج:۱،ص:۱۳)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب قول، فعل، تقریر، نیز آپ کی صفات وایام سنت ہیں۔ حافظ سخاویؒ جنھوں نے سنت کی تعریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور آپ سے متعلق تاریخ وواقعات کو بھی شامل کیا ہے، الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ انھوں نے یہی تعریف حدیث کی بھی کی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ حدیث وسنت ان کے نزدیک ایک ہی ہیں۔

حدیث وسنت کو ایک معنی میں استعمال کی چند مثالیں

حافظ سخاویؒ اور علامہ فرنگی محلیؒ دونوں حضرات نے صراحت کی ہے کہ ائمہ حدیث کے کلام اور تصرفات سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث وسنت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، یعنی ان میں باہم نسبت تساوی کی ہے، تباین یا عام، خاص کی نسبت نہیں، ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

۱- امام ابوداؤد سجستانی متوفی ۲۷۵ھ اہلِ مکہ کے نام اپنے مشہور رسالہ ومکتوب میں اپنی سنن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فإن ذُكرلك عن النبي صلى الله عليه وسلم سُنّة ليس مما خرّجته فاعلم أنه حديث واهٍ" (رسالۃ الامام ابوداؤد السجستانی الی اہل مکۃ فی وصف سننہ مع تعلیق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، ص:۳۴)

"اگر تم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کوئی سنت ذکر کی جائے، جس کی تخریج میں نے (اس کتاب میں) نہیں کی ہے تو جان لو کہ یہ حدیث ضعیف ہے"

امام ابوداؤد کی اس عبارت میں سنت وحدیث کا مرادف وہم معنی ہونا بالکل ظاہر ہے۔

۲- امام حافظ ابوبکر محمد بن موسیٰ حازمی متوفی ۵۸۴ھ ناسخ ومنسوخ کے موضوع پر اپنی نہایت مفید کتاب "الاعتبار في الناسخ والمنسوخ من الآثار" میں کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

فهذا كتاب أذكر فيها ما انتهيت إلى معرفته من ناسخ حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم ومنسوخه (خطبۃ الکتاب،ص:۳) اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ناسخ ومنسوخ حدیثوں کا ذکر کروں گا، جن کی معرفت تک میں پہنچ سکا ہوں، اسی خطبۂ کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

وإنما أوردنا نبذة منها ليعلم شدة اعتناء الصحابة بمعرفة الناسخ والمنسوخ في كتاب الله وسنة نبيه صلى الله عليه اذ شأنهما واحدة" (ص:۵)

میں نے یہ چند روایتیں پیش کی ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ قرآن وسنت میں ناسخ ومنسوخ کی معرفت کا صحابۂ کرام کو کس درجہ اہتمام تھا کیونکہ دونوں کی صفت (وجوب عمل میں) ایک ہے۔ پہلی عبارت میں حدیث ناسخ ومنسوخ کا اور دوسری عبارت میں ناسخ ومنسوخ سنت کا لفظ استعمال کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ امام حازمی حدیث وسنت کو ایک معنی میں لیتے ہیں۔

۳- سنت کی لغوی تحقیق میں امام نوویؒ کی یہ عبارت تہذیب الأسماء والصفات کے حوالہ سے اوپر ذکر کی جاچکی ہے۔

وتطلق سنته ﷺ على الأحاديث المروية عنه صلى الله عليه وسلم.

اور سنت رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اطلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث پر ہوتا ہے۔ امام نوویؒ کی اس عبارت سے سنت وحدیث کا ایک ہونا بالکل ظاہر ہے۔

۴- شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانیؒ حدیث وخبر کے درمیان فرق کے قول کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومن ثم قيل لمن يشتغل بالتواريخ وما شاكلها الأخباري، ولمن يشتغل بالسنة النبوية المحدث، وقيل بينهما عموم وخصوص مطلقاً فكل حديث خبر من غير عكس (نزہۃ النظر مع نور القمر،ص:۲۷)

اسی فرق کی بناء پر جو شخص تاریخ یا تاریخ جیسے امور میں اشتغال رکھتا ہے اسے اخباری (مورخ) کہا جاتا ہے اور جو سنت نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں مشغول رہتا ہے اسے محدث کہا جاتا ہے، اور کہا گیا ہے کہ خبر وحدیث میں عموم وخصوص کی نسبت ہے۔ لہٰذا ہر حدیث خبر ہے اور ہر خبر حدیث نہیں ہے۔ اس عبارت میں ایک جگہ سنت اور دوسری جگہ حدیث کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک دونوں ایک ہیں۔

بغرض اختصار صرف چار مثالوں پر اکتفاء کیا گیا ورنہ علمائے حدیث کے کلام سے دونوں

کے مترادف ہونے کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

عام طور پر متأخرین محدثین حدیث وسنت کی اوپر مذکور یہی تعریف کرتے ہیں، اور اپنے کلام میں عام طور پر دونوں کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں جیسا کہ اوپر کی بیان کردہ تفصیلات سے معلوم ہوچکا ہے۔

ایک قدیم اصطلاح: علامہ محمد بن جعفر کتّانی متوفی ۱۳۴۵ھ اپنی مشہور اور نہایت مفید تصنیف "الرسالة المستطرفة لبیان مشهور کتب السنة المشرفة" میں کتب سنن کے تعارف میں لکھتے ہیں:

"ومنها کتب تعرف بالسنن وهی في اصطلاحهم الكتب المرتبة على الأبواب الفقهية من الإيمان والطهارة والزكاة إلى آخرها وليس فيها شيء من الموقوف لأن الموقوف لا يسمّٰى في اصطلاحهم سنة ويسمى حديثًا" (ص:۲۹)

اور ان کتب حدیث میں بعض وہ ہیں جو سنن سے معروف ہیں اور سنن ان کی اصطلاح میں ابواب فقہیہ پر مرتب کتابیں ہیں یعنی ایمان، طہارت، صلاۃ، زکوٰۃ الی آخرہ یعنی اسی ترتیب پر پوری کتاب مرتب ہوتی ہے۔ اور سنن کی کتابوں میں موقوف روایتیں نہیں ہیں؛ کیونکہ ان کی اصطلاح میں موقوف کو سنت نہیں کہا جاتا ہے، بلکہ حدیث کہا جاتا ہے۔

سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱۶ھ نے بھی اس اصطلاح کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

السلف أطلقوا الحديث على أقوال الصحابة والتابعين لهم بإحسان وآثارهم وفتاواهم (خلاصہ،ص:۳۳ ملاعلی کی شرح شرح نخبة الفکر کے صفحہ ۱۵۳ پر ''خبر، حدیث اور اثر'' کے بیان میں کتاب کے محقق نے خلاصہ کی یہ عبارت اپنی تعلیق میں نقل کی ہے)

ائمہ سلف نے ''حدیث'' کا اطلاق صحابہ اور تابعین کے اقوال، آثار اور ان کے فتاویٰ پر کیا ہے۔

غالبًا اسی اصطلاح کے مطابق امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ نے امام سفیان ثوریؒ کی علوم میں جامعیت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

الناس على وجوه، فمنهم من هو إمام في السنة وإمام في الحديث، ومنهم من هو إمام في السنة وليس بإمام في الحديث، ومنهم من هو إمام في الحديث ليس بإمام في السنة، فأما من هو إمام في السنة وإمام في الحديث فسفيان الثوري (تقدمة الجرح والتعديل لابن ابی حاتم،ص:۱۱۸)

علماء متعدد صفات کے حامل ہیں، ان میں بعض وہ ہیں جو سنت میں امام ہیں اور حدیث میں بھی امام ہیں، اوران میں بعض وہ ہیں جو سنت میں امام ہیں اور حدیث میں امام نہیں ہیں، اوران میں بعض وہ ہیں جو حدیث میں امام ہیں سنت میں امام نہیں ہیں تو جو سنت اور حدیث دونوں میں امام ہیں وہ سفیان ثوریؒ ہیں۔ یعنی سفیان ثوریؒ احادیث مرفوعہ اور صحابہ وتابعین سے منقول آثار اور فتاویٰ سب میں امام وپیشوا تھے۔

متقدمین ائمہ حدیث کی سنت وحدیث کے بارے میں فرق کی یہ ایک اصطلاح تھی؛ لیکن متأخرین کے یہاں اس اصطلاح کا استعمال نہیں ہے۔ متقدمین ائمہ حدیث اگرچہ سنت وحدیث کے درمیان اصطلاحی طور پر یہ فرق کرتے ہیں؛ لیکن عام طور پر وہ شریعت میں صحابہ کے قول کو بھی حجت مانتے ہیں؛ اس لئے اس اصطلاحی فرق سے ان کی حجیت میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

ایک اور اصطلاح: بہت سے اصولیین اور بعض محدثین بھی سنت وحدیث میں اصطلاحی طور پر یہ فرق کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل، تقریر اور طریق صحابہ سب پر سنت کا لفظ بولتے ہیں، اور حدیث وخبر کا اطلاق صرف آپ ﷺ کے فعل پر کرتے ہیں۔ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی لکھتے ہیں:

ذكر ابن مَلَك في "شرح منار الأصول" أنّ سنة تطلق على قول رسول الله صلى الله عليه وسلم وفعله، وسكوته وطريقة الصحابة، والحديث والخبر مختصان بالأول.

سنت کا اطلاق رسول خدا ﷺ کے قول، فعل، سکوت، اور طریقۂ صحابہ پر کیا جاتا ہے اور حدیث وخبر پہلے (یعنی قول رسول اللہ ﷺ) کے ساتھ خاص ہیں۔ (ظفر الامانی ص:۲۴-۲۵)

محقق علاء الدین عبدالعزیز بخاری متوفی ۷۳۰ھ اصول بزدوی کی عبارت "تمسكاً بالسنة والحديث" کے تحت لکھتے ہیں:

السنة أعم من الحديث لانها تتناول الفعل والقول، والحديث مختص بالقول" الخ (کشف الاسرار، ج:۱، ص:۵۹)

''سنت''، ''حدیث'' سے عام ہے کیونکہ سنت فعل وقول (سب کو) شامل ہے اور حدیث قول کے ساتھ خاص ہے۔ یہی تفصیل تلویح اور عضدی میں بھی ہے۔

لفظ سنت وحدیث کے درمیان استعمال کا یہ فرق بھی بس اصطلاح ہی کی حد تک ہے، جس سے ان کی حجیت قطعاً متاثر نہیں ہوگی؛ کیونکہ جو حضرات سنت کو عام معنی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کے قول وفعل کے معنی میں لیتے ہیں وہ تو اسے حجت مانتے ہی ہیں اور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو حدیث سے تعبیر کرتے ہیں اور سنت کا اطلاق اس پر نہیں کرتے ہیں وہ بھی اس حدیث قولی کو حجت قرار دیتے ہیں۔

سنت علمائے اصول کی اصطلاح میں

علمائے اصول جن کا موضوع احکام شرعی کے اصول و مآخذ کا بیان، اور کتاب وسنت کے نصوص سے اخذ معانی وغیرہ کے قواعد وضوابط کی تنقیح وتدوین ہے، جب وہ اپنے موضوع کے مطابق فقہی احکام کے دوسرے مصدر و مآخذ کی حیثیت سے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہیں تو اپنے فن کے تحت سنت کی تعریف بھی بیان کرتے ہیں بطور نمونہ اصول فقہ کی مستند و معروف چند کتابوں سے یہ تعریف نقل کی جارہی ہے۔

۱- قاضی بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ "منهاج الوصول إلى علم الأصول" میں لکھتے ہیں:

الكتاب الثاني في السنة: وهو قول الرسول صلى الله عليه وسلم او فعله الخ.

کتاب ثانی سنت کے بیان میں اور سنت رسول اللہ ﷺ کا قول یا فعل ہے۔

شیخ جمال الدین اسنوی متوفی ۷۷۲ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

أقول: السنة لغة هي العادة والطريقة قال الله تعالى: "قد خَلَتُ مِنُ قَبُلِكُم سُنَنٌ فَسِيُرُوا في الاَرضِ" اى طرق، وفي الاصطلاح تطلق على ما يقابل الفرض من العبادات، وعلى ما صدر من النبي صلى الله عليه وسلم من الأفعال أو الأقوال ليست للإعجاز وهذا هو المراد ههنا، ولما كان التقرير عبارة من الكف عن الإنكار والكف فعل كما تقدم استغنى المصنف عنه به أى عن التقرير بالفعل" (نهاية السول في شرح منهاج الوصول إلى علم الأصول على الهامش التقرير والحبير، ج:۲، ص:۵۲)

میں کہتا ہوں کہ سنت لغت میں عادت اور طریقہ کے معنی میں ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قد خلت الخ یعنی تحقیق کہ تم سے پہلے طریقے گذر چکے ہیں، لہٰذا زمین میں گھوم پھر (کر انہیں دیکھ لو) (آیت میں مذکور لفظ سُنَن بمعنی) طریقے ہے، اور اصطلاح میں (۱) ان عبادتوں پر سنت کا اطلاق ہوتا ہے جو فرض کے مقابل ہیں، (۲) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ان افعال واقوال پر ہوتا ہے جو (صراحتاً) قرآن میں نہیں ہیں، اور اس جگہ یہی دوسرا اصطلاحی معنی مراد ہے، اور جب انکار سے رکنے کو تقریر سے تعبیر کیا جاتا ہے تو "کف" یعنی رکنا (ایک) فعل ہے اس لئے

قول کے ساتھ فعل کے ذکر کے بعد تقریر کے ذکر کی مصنف نے ضرورت نہیں سمجھی۔

۲- امام ابواسحاق الشاطبی متوفی ۷۹۰ھ لکھتے ہیں:

ویطلق لفظ السنة علی ما جاء منقولا عن النبي صلی اللّٰه علیه وسلم علی الخصوص بما لم ینص علیه في الکتاب العزیز بل إنما نص علیه من جهته علیه الصلوٰة والسلام کان بیاناً لما في الکتاب؛ أولاً، ویطلق أیضاً في مقابلة البدعة، فیقال: ”فلان علی سنة إذا عمل علی وفق ما عمل علیه النبي صلی اللّٰه علیه وسلم، کان ذلك مما نص علیه في الکتاب أولاً، ویقال: فلان علی بدعة ”إذا عمل علی خلاف ذلك، وکأن هذا الإطلاق إنما اعتبر فیه عمل صاحب الشریعة فأطلق علیه لفظ السنة من تلك الجهة، وإن کان العمل بمقتضی الکتاب.

ویطلق أیضا لفظ السنة علی ما عمل علیه الصحابة وجد ذلك في الکتاب أو السنة أو لم یوجد لکونه اتباعاً لسنة ثبتت عندهم لم تنقل إلینا، أو اجتهادًا مجتمعاً علیه منهم أو من خلفائهم... وإذا جمع ما تقدم تحصل منه في الإطلاق أربعة أوجه، قوله علیه الصلاة والسلام، وفعله، وإقراره- وکل ذلك إما متلقی بالوحی أو بالاجتهاد، وهذه ثلاثة، والرابع ما جاء عن الصحابة أوالخلفاء. (الموافقات، ج:٤، ص:٣ تا ٦)

اورلفظ سنت ان امور پر بولا جاتا ہے جو نبی ﷺ سے منقول ہوکر آئے ہیں بالخصوص وہ امور جوقرآن مجید میں منصوص نہیں ہیں؛ بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی جانب سے مذکور ہیں، پھر وہ امور قرآن کی مراد کا بیان وتفسیر ہوں، یا ایسے نہ ہوں۔

اورسنت کا لفظ بدعت کے مقابلہ میں بھی بولا جاتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے فلاں سنت پر ہے؛ جبکہ اس کا عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق ہو، خواہ یہ عمل ان اعمال میں سے ہو جن کی قرآن میں صراحت کی گئی ہے، یا ایسا نہ ہو، اور کہا جاتا ہے فلاں بدعت پر ہے؛ جبکہ اس کا وہ عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق نہ ہو، گویا اس اطلاق میں صاحب شریعت (ﷺ) کے عمل کا اعتبار کیا گیا ہے، اور اسی لحاظ سے اس پر سنت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اگرچہ وہ عمل بتقاضائے کتاب الٰہی ہو۔

نیز لفظ سنت کا اطلاق صحابہ کرامؓ کے عمل پر بھی ہوتا ہے قرآن وحدیث میں اس کے وجود سے ہم واقف ہوں یا نہ ہوں؛ کیونکہ صحابہؓ کا یہ عمل یا تو سنت کی اتباع میں ہوگا جو ان کے نزدیک

ثابت تھی اور ہم تک نہیں پہنچی یا ان کے اجماعی اجتہاد یا خلفاء کے اجتہاد کی بناء پر ہوگا... ان مذکورہ صورتوں کو جمع کیا جائے تو سنت کے اطلاق کی چار صورتیں نکلیں گی: (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول، (۲) آپ کا فعل، (۳) آپ کا اقرار و اثبات اور یہ سب یا تو وحی سے حاصل شدہ ہوں گی یا اجتہاد سے یہ تین قسمیں ہوئیں، (۴) اور چوتھی قسم صحابہؓ یا خلفاءؓ سے ثابت شدہ امور ہیں۔

محقق ابن ہمام متوفی ۸۶۱ھ نے اصول فقہ میں اپنی مشہور و کثیر الفائدہ تصنیف ''التحریر'' میں سنت کی تعریف یہ کی ہے: ”وفي الاصول قوله عليه السلام وفعله و تقريره وفي فقه الحنفية: ما واظب على فعله مع ترك بلا عذر ليلزم كونه بلا وجوب، وما لم يواظبه مندوب ومستحب“ (التقریر والتحبیر شرح التحریر، ج:۲،ص:۲۲۳)

سنت اصول فقہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل اور تقریر کو کہتے ہیں، اور فقہ حنفی میں جس فعل پر آپ نے مواظبت فرمائی ہے بغیر عذر کے کبھی کبھار ترک کے ساتھ (ترک بلا عذر کی قید اس لئے ہے) تاکہ لازم ہو جائے کہ اس فعل پر ہمیشگی بطور وجوب کے نہیں تھی (کیونکہ بلا عذر ترکِ فعل کی واجب میں رخصت و اجازت نہیں)

اس تعریف کا صاف مطلب یہ ہے کہ فقہائے اصول جب فقہ کے ادلۂ اربعہ کے ضمن میں سنت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی تعریف آنحضرت ﷺ کے قول و فعل سے کرتے ہیں تو یہی سنت ان کے نزدیک مسائل کے لئے دلیل و حجت ہوتی ہے اور عبادات کے مراتب کی تعیین کے وقت بالخصوص فقہائے احناف فرض و واجب کے بعد اور نفل سے پہلے جب لفظ سنت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی تعریف ما واظب على فعله الخ يا الطريقة المسلوكه في الدين سے کرتے ہیں تو اس سنت کا ان کے نزدیک احکام شرعی کی حجت و دلیل ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ بلکہ یہ تو اس حکم شرعی کا عرفی نام ہے جو آنحضرت ﷺ کے عمل مع المواظبة بترك ما سے ثابت ہوا ہے۔

سنت کی اصولی و فقہی یہی تعریفیں قدیم و جدید سب مصنّفین اپنی اصول فقہ کی کتابوں میں بیان کرتے ہیں، ان سب کے ذکر میں تکرار محض اور طوالت ہے؛ اس لئے بطور نمونہ تین ماہر فن علماء کی تحریروں پر اکتفا کیا جارہا ہے، جن میں پہلے شافعی دوسرے مالکی اور تیسرے حنفی ہیں۔

❀ ❀ ❀

بیس رکعات تراویح اہل سنت والجماعت کی علامت ہے

از: مولانا محمد شفیع قاسمی، بھٹکلی

تراویح ترویحہ کی جمع ہے۔ یعنی اطمینان سے پڑھی جانے والی نماز، ہر چار رکعات کو ایک ترویحہ کہتے ہیں۔ پانچ ترویحہ یعنی بیس (۲۰) رکعات تراویح دس سلاموں کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وامام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، وجمہور علماء اہل سنت والجماعت کے نزدیک سنت موکدہ ہے۔

(۱) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ امیر المومنین حضرت سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجھے رمضان المبارک میں رات کو تراویح پڑھانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ لوگ دن میں روزہ تو رکھ لیتے ہیں مگر قرآن (یاد نہ ہونے کی وجہ سے) تراویح نہیں پڑھ سکتے، اس لئے ان لوگوں کو رات میں تراویح پڑھاؤ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا امیر المومنین! یہ ایسی چیز کا حکم ہے جس پر عمل نہیں ہے (یعنی باجماعت تراویح) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: میں جانتا ہوں لیکن یہی بہتر ہے، تو انھوں نے (حضرت ابی بن کعبؓ نے) بیس (۲۰) رکعات تراویح پڑھائی۔ (اسنادہ حسن، المختارہ للضیاء المقدسی ۱۱۶۱)

(۲) حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں رمضان المبارک کے مہینے میں حضرات صحابہ وتابعین بیس (۲۰) رکعات تراویح پڑھتے تھے اور وہ سو سو آیتیں پڑھا کرتے تھے اور امیر المومنین حضرت سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شدت قیام یعنی طول قیام کی وجہ سے اپنی لاٹھیوں پر ٹیک لگایا کرتے تھے۔ (الصیام للفریابی مخرج ۱۷۶، وسنن بیہقی ۴۸۰۱، اس حدیث کے صحیح ہونے پر جمہور محدثین کا اتفاق ہے)

(۳) علامہ ابن حجر عسقلانیؒ امام مالک کی روایت نقل کرتے ہیں۔ اور امام مالکؒ نے یزید بن خصیفہؒ کے طریق سے حضرت سائب بن یزیدؓ سے بیس (۲۰) رکعات نقل کی ہے۔ (فتح الباری)

(۴) علامہ ابن حجر عسقلانیؒ تلخیص الحبیر میں حدیث نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان المبارک کی ایک رات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بیس (۲۰) رکعات تراویح پڑھائی، دوسری رات بھی صحابہ جب جمع ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کو بیس رکعات تراویح پڑھائی اور جب تیسری رات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد مسجد میں جمع ہوئی تو آپ ﷺ تشریف نہیں لائے پھر صبح میں ارشاد فرمایا: مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں یہ نماز (تراویح) تم پر فرض کردی جائے اور تم کرنہ سکو۔

بیس (۲۰) رکعات تراویح پر صحابہ وعلماء امت کا اجماع ہے۔

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی امامت میں لوگوں کو تراویح باجماعت پڑھنے کا فیصلہ فرمایا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے بعد تراویح کی پہلی عام جماعت تھی۔ (صحیح ابن حبان)

(۲) حضرت یزید بن رومانؒ (تابعی) فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صحابہ تیئس (۲۳) رکعات (بیس رکعات تراویح اور تین رکعات وتر) پڑھا کرتے تھے۔ (موطا امام مالک ۲۵۲، اسنادہ مرسل قوی، آثار السنن ۶/ ۵۵)

(۳) امام شافعیؒ (تبع تابعی) فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر مکہ مکرمہ میں بیس (۲۰) ہی رکعات تراویح پڑھتے دیکھا ہے۔ (الأم وسنن ترمذی)

(۴) امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور صحابہ کے عمل کی بنا پر اکثر علماء کے نزدیک تراویح بیس (۲۰) رکعات ہے۔ (سنن ترمذی)

(۵) علامہ علاء الدین کاسانی حنفیؒ لکھتے ہیں کہ صحیح قول جمہور علماء کا یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی امامت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تراویح پڑھانے پر جمع فرمایا تو انھوں نے بیس رکعات تراویح پڑھائی۔ تو یہ صحابہ کی طرف سے اجماع تھا۔ (بدائع الصنائع)

(۶) علامہ ابن رشد قرطبی مالکیؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ کے ایک قول کے مطابق اور امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام داؤد ظاہریؒ کے نزدیک وتر کے علاوہ بیس (۲۰) رکعات تراویح سنت ہے۔ (بدایۃ المجتہد)

(۷) علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں کہ تراویح کی بیس (۲۰) رکعات سنت موکدہ ہے، سب سے پہلے اس سنت کو رسول اللہ ﷺ نے ادا فرمایا۔ (المغنی)

(۸) علامہ نووی شافعیؒ لکھتے ہیں۔تراویح کی رکعات کے متعلق ہمارا (شوافع) کا مسلک وتر کے علاوہ بیس (۲۰) رکعات کا ہے، دس سلاموں کے ساتھ، اور بیس (۲۰) رکعات پانچ ترویحات ہیں اور ایک ترویحہ چار (۴) رکعات کا دو سلاموں کے ساتھ، یہی امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب اور امام احمد بن حنبلؒ اور امام داؤد ظاہریؒ کا مسلک ہے اور قاضی عیاضؒ نے بیس (۲۰) رکعات تراویح کو جمہور علماء سے نقل کیا ہے۔ (المجموع)

(۹) علامہ ابن تیمیہ حنبلیؒ لکھتے ہیں: حدیث سے ثابت ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (صحابی) نے لوگوں کو بیس (۲۰) رکعات تراویح اور تین رکعات وتر پڑھائی، اسلئے جمہور علماء کے نزدیک یہی سنت ہے۔ کیونکہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے مہاجرین اور انصار کی موجودگی میں بیس (۲۰) رکعات تراویح پڑھائی تو کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ)

(۱۰) استاذ الاساتذہ مجاہد آزادی شیخ محمود حسن قاسمی دیوبندیؒ فرزند اوّل و سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں کہ جب کبار صحابہ اور خلفاء راشدین بیس (۲۰) رکعات تراویح پر متفق ہوگئے، تو اس سے بڑھ کر کونسی قوی ترین دلیل ہوسکتی ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال کو سب سے زیادہ جاننے والے وہی حضرات تھے۔ جب انھوں نے بیس (۲۰) رکعات کے علاوہ کے قول وعمل کو ترک کیا تو معلوم ہوا کہ بیس (۲۰) رکعات کے سلسلہ میں ان کے پاس قوی ترین ثبوت موجود تھا اور اہل حدیث حضرات جو آٹھ (۸) رکعات تراویح کہتے ہیں، اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، یہ ان کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ تہجد اور تراویح میں فرق نہیں کرتے، حالانکہ تہجد اور تراویح میں بہت بڑا فرق ہے اس لئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تہجد پوری رات پڑھنے کی نفی کرتی ہیں جب کہ تراویح سحری تک پڑھی گئی ہے۔

(مزید تفصیل ودلائل کے لئے راقم کی کتاب ''تراویح سنت کے مطابق پڑھئے'' کا مطالعہ کریں۔ ملنے کا پتہ مکتبہ شفیع، رضیۃ الابرار، سلمان آباد، بھٹکل ۵۸۱۳۲۰)

❀ ❀ ❀

بچوں کی تربیت کیسے کریں

از: مولانا میر زاہد مکھیالوی
ناظم تعلیمات جامعہ فلاح دارین الاسلامیہ، بلاسپور مظفر نگر

یقیناً یہ ایک پیچیدہ اور اہم مسئلہ ہے، ہر ذمہ دار اور نگراں پر اپنے متعلق ماتحتوں کی تربیت کا فریضہ عائد ہوتا ہے، استاذ کے ذمہ اپنے شاگردوں کی، شیخ کے اوپر اپنے مریدین کی، والدین پر اپنی اولاد کی، ان کی نفسیات کا لحاظ رکھ کر صحیح تربیت کرنا لازم اور ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے، الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ (مشکوۃ،ص:۳۲۰) (مسلمانو! تم میں سے ہر ایک حکمراں ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کی نسبت سوال کیا جائے گا) بچپن میں بچہ کے دل کی تختی چونکہ صاف شفاف ہوتی ہے۔ پھر جیسے ماحول میں بچہ کی نشو ونما ہوتی ہے ایسے ہی اثرات اس کے دل ودماغ پر نقش ہوجاتے ہیں اور عام طور سے اسی پر اس کی آئندہ زندگی کی تعمیر ہوتی ہے لہٰذا مربی کے لئے ضروری ہے کہ وہ بچہ کے لئے خوشگوار ماحول مہیا کریں شریر بچوں سے الگ رکھیں گھریلو زندگی میں بھی کوئی نامناسب بات یا غیر مہذب حرکت بچہ کے سامنے نہ کریں، حرکات وسکنات میں بھی سنجیدگی ومتانت ہو، بول چال میں پیار ومحبت اور تنبیہ میں توازن اور اعتدال قائم رہنا چاہئے، تہذیب وشائستگی کا خیال رکھے، چونکہ غیر محسوس طریقہ پر تمام چیزیں بچہ کے اندر منتقل ہوتی ہیں، اور وہ جس طرح کوئی کام دیکھتا یا کوئی بات سنتا ہے، عملاً اس کو اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے، بچہ کی اخلاقیات پر بھی خاص توجہ دی جائے، محبت میں اس کی عادتیں بگڑنا شروع ہوجاتی ہیں، شریعت مطہرہ نے ہر موقعہ پر اعتدال کی تعلیم دی ہے۔

صحیح تربیت کردینا کروڑوں کی ملکیت سے بہتر ہے

میرے مربی حضرت مفتی مہربان علی شاہ بڑوتیؒ (جنہیں اللہ تعالیٰ نے تربیت کے باب میں خاص ملکہ دیا تھا) اپنے ایک مخصوص وصیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں: ''بچہ کی صحیح تربیت کردینا کروڑوں کا مالک بنادینے سے بہتر ہے'' مزید فرمایا کہ اس زمانہ میں بہت سے لوگ اولاد کے لئے پریشان ہیں (کہ کوئی اولاد نہیں) اور بہت سے لوگ اپنی اولاد سے پریشان ہے (کہ بچپن

میں صحیح تربیت نہیں کی گئی، پیار پیار میں ان کو بگاڑ دیا پھر پریشان ہیں کہ کیا کریں اولاد مطیع نہیں لڑکے نے بدنام کردیا، جینا مشکل کردیا وغیرہ) نیز یہ بھی اس زمانہ کا عام مزاج بنا ہوا ہے کہ اپنا بچہ اگر کوئی غلطی کردے یا کوئی غلط بات زبان سے نکال دے یا کسی دوسرے کے ساتھ بدتمیزی کرے تو اس کے والدین یا مربی یہ کہہ کر بات ختم کردیتے ہیں کہ بچہ ہی تو ہے آہستہ آہستہ سنور جائے گا، حالانکہ بچپن کا دور ہی بگڑنے سنورنے کا ہوتا ہے، اس وقت مزاج کے اندر فساد اور بگاڑ آ گیا تو پھر مستقبل کا سنورنا مشکل ہوجاتا ہے، لہٰذا بچہ کی سچی محبت اور اصلی ہمدردی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر ہر موقع پر اس کی نگرانی کی جائے، نامناسب امور میں اسے فہمائش کی جائے، وہ کسی کی جانب لالچ کی نگاہ نہ ڈالے، شروع ہی سے اس کو عادی بنایا جائے کہ وہ ہر چیز کا سوال اللہ سے کرے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو بچپن میں تعلیم فرماتے ہیں ”اے بچے! خدا کو یاد رکھ تو اس کو اپنے سامنے پائے گا، اور جب تو سوال کرے تو اللہ ہی سے سوال کر اور جب تو مدد چاہے تو اللہ ہی سے مدد مانگ اور جان لے اس بات کو کہ اگر تمام لوگ اس بات پر اتفاق کرلیں کہ تجھ کو کچھ نفع پہنچانا چاہیں تو ہرگز اس کے سوا کچھ نفع نہیں پہنچا سکتے جو کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے واسطے لکھ دیا ہے اور اگر سب لوگ اس پر متفق ہوجائیں کہ تجھے کچھ نقصان پہنچانا چاہیں تو ہرگز اس کے سوا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے جو اللہ نے تیرے واسطے لکھ دیا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف، ص:۴۵۳)

تربیت کرنے میں کن اُمور کو ملحوظ رکھا جائے

بچپن سے ہی توحید کی بنیاد پر بچہ کی ذہن سازی کی جائے اور اس کا یقین اللہ کی ذات پر پختہ کرادیا جائے تو اس کے اثرات نمایاں محسوس ہوتے ہیں، توہمات سے اس کا دل ودماغ پاک رہتا ہے اس کے اندر غیرت اور خودداری آجاتی ہے اور بچپن میں بنا ہوا یقین دل میں پختگی کے ساتھ جم جاتا ہے۔ میرے ایک قریبی دوست کا بچہ ہے کم سنی کے باوجود اس کی نیک خصلتیں دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے، مثلاً کوئی چیز اسے دے کر واپس لیں تو واپس کردینا، کھانے کی چیز اگر اس کے ہاتھ میں ہے تو پہلے دوسروں کو دے کر پھر خود کھانا پیسے مانگنے کو منع کردیا تو ضد نہ کرنا، رونے پر فہمائش کرنے سے چپ ہوجانا، کلمہ یا سلام جو اسے سکھایا جائے تو اسے ادا کرنا وغیرہ، یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں، لیکن حقیقت میں ان کی بنیادی حیثیت ہے، اور بلاشبہ اس میں والدین کی تربیت کا دخل ہوتا ہے۔

یہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ بچہ بہرحال بچہ ہوتا ہے اس کو ہر ہر بات میں اتنا محتاط اور

حساس بنادینا کہ وہ اپنی فطری عادتوں اور جائز شرارتوں کو بھی گناہ سمجھنے لگے اور اپنے عمل اور گفتگو سے کوئی بزرگ محسوس ہو یہ اس کے بچپن کے ساتھ زیادتی ہے، بڑے ہوکر ایسے بچوں کے جذبات پر یا تو ایک پژمردگی سی آجاتی ہے، یا بچپن کی محرومیوں کا جوانی میں تدارک کرتا ہے جو زیادہ خطرناک ہے، اس لئے اخلاق وعادات کی اصلاح کے ضمن میں اعتدال اور توازن بہت ضروری ہے عموماً بچہ کی عادت پیسے مانگنے کی ہوتی ہے، اس عادت کو حد اعتدال میں رکھا جائے نہ تو یہ کہ اٹھتے بیٹھتے پیسے لینے ہی کو بچہ وظیفہ بنالے اور نہ ایسا کرے کہ بچہ احساس محرومی کا شکار ہوجائے کوئی دوست یا مہمان یا کوئی بھی آدمی کچھ چیز پیسے وغیرہ دے تو بچہ اپنے والدین کی اجازت بلکہ حکم کے بغیر نہ لے، کسی سے یونہی کوئی چیز لینے سے بھی عادت بگڑ جاتی ہے، چنانچہ آئندہ وہ شخص آجائے تو لالچ کی نگاہ بچہ اس پر ڈالتا ہے اور اُمید لگائے ہوتا ہے۔ اگر وہ آدمی دستی وغیرہ نکالنے کے لئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے تو بچہ سمجھتا ہے کہ میرے لئے پیسے نکال رہے ہیں۔

مربی اس کا بھی خیال رکھے کہ ہمہ وقت بچہ کو ڈانٹ ڈپٹ یا فہمائش نہ کرتا رہے کہ اس سے یقیناً وہ بجائے مانوس ہونے کے متوحش ہوجاتا ہے، بلکہ فرمانِ رسول ﷺ من لم یرحم صغیرنا الخ (جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں) کو ملحوظ رکھ کر اُنس ومحبت کے ساتھ اس کی جائز ضد بھی پوری کی جائے یہ نہ ہو کہ بعض دفعہ تو دس دس روپے دیدیئے اور بعض اوقات جیب خالی ہے تو ایک روپیہ بھی نہیں دیا گیا اس پر بچہ یقیناً ضد کرتا ہے اور پریشان ہوتا ہے، عادت چونکہ اس کی خرچ کرنے کی بن چکی ہے، اب اگر اس کے صرفہ میں تنگی ہوتی ہے تو پھر وہ ادھر اُدھر غلط نظر ڈالتا ہے۔ اس طرح چوری وغیرہ کی غلط عادت بھی بن سکتی ہے۔

الحاصل تربیت کا مسئلہ بڑا نازک ہوتا ہے، اس کے کچھ ضابطے، قوانین یا کچھ لکیریں مقرر نہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر تربیت کی جاتی رہے، بلکہ تربیت کے طریقے، احوال ومواقع نفسیات وجذبات اور خیالات کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، جتنے بچے والدین کی زیر تربیت ہیں، یا جس قدر طلبہ یا مریدین استاذ وشیخ کے یہاں حلقہ بگوش ہیں ہر ایک کے مزاج وعمر کے لحاظ سے تربیت کرنا لازم ہے، سب کو ایک لکڑی سے نہ ہانکا جائے۔ محسن انسانیت، مربیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی باب تربیت میں جو تعلیمات ہیں اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرامؓ کی تربیت کا عملی نمونہ مربی حضرات کے لئے مشعل راہ ہیں، طریق نبویؐ کے مطابق جو تربیت کی جائے گی بلاشبہ وہ باعث خیر وبرکت ہوگی اور اس کے نمایاں اثرات مشاہد ہوں گے۔ انشاء اللہ۔

اللّٰهم احسن عاقبتنا فی الامور کلها.

مذہبی آزادی - بقائے باہم کا ایک درخشاں اصول
(قرآن وسنت کے تناظر میں)

از: ریحان اختر
ریسرچ اسکالر، شعبۂ سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اسلام ایک استدلالی وعقلی اور مبرہن ومدلل مذہب ہے۔ جسے مالک الملک نے ایک اصول وضابطے کی شکل میں کائنات انسانی میں بسنے والے لوگوں کے لئے طے کرکے دنیا میں اتار دیا ہے۔ یہ انسان کے لئے زندگی کے تمام تر شعبہ جات میں اس کی مکمل رہنمائی کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا، اس کی تبلیغ ودعوت کے اصول حکمت ودانشمندی، وعظ وتلقین اور بحث ومباحثہ پر قائم ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ پر جو صحیفۂ ربانی نازل ہوا، اس نے سب سے پہلے عقل انسانی کو مخاطب کیا۔ اور غور وفکر، فہم وتدبر کی دعوت دی کہ اسلام اپنی کسی بھی تعلیم کو لوگوں پر زبردستی نہیں تھوپتا ہے۔ بلکہ وہ لوگوں کو غور وفکر کا موقع فراہم کرتا ہے۔ حق وباطل کے امتیاز کو واضح کرتا ہے۔ ضلالت وگمراہی اور نجات وفلاح کے راستے سے لوگوں کو روشناس کراتا ہے پھر یہ کہ جو مذہب اپنی ترویج واشاعت کے لئے دعوت وتبلیغ، ارشاد وتلقین کا راستہ اختیار کرنے اور سوچنے سمجھنے کا لوگوں سے مطالبہ کرتا ہو، وہ بھلا کیوں کسی مذہب کے پیروکاروں کو جبر وکراہ کے ذریعہ اپنے مذہب میں داخل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور زور زبردستی اختیار کرے گا۔ متعصبین اور معاندین اسلام اس کی اشاعت کو فتوحات اور ملکی محاربات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے ان کی زبان نہیں تھک رہی ہے کہ، اسلام کو بزور شمشیر پھیلایا گیا ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام نے اپنی ذاتی خوبیوں اور محاسن سے لوگوں کو اپنا مطیع فرمان نہیں بنایا بلکہ اپنی طاقت وقوت سے جبر واکراہ کے ذریعہ دین اسلام کا قلادہ ان کی گردن میں ڈال دیا ہے اور اسی جبر واکراہ نے امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ رضا ورغبت کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ لیکن ہم تعلیمات اسلام کی روشنی میں اس قسم کی مسموم ذہنیت رکھنے والوں کے باطل خیالات کو پرکھیں گے، کہ قرآنی آیات اور تعلیمات نبوی ﷺ میں مذہبی آزادی کے سلسلہ میں کیا احکام وتعلیمات موجود ہیں اور اسلام کے ماننے والے ان تعلیمات پر کتنا عمل پیرا ہوئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو طویل معرکہ آرائیوں سے سابقہ پڑا ہے۔ ان کے یہ محاربات جارحانہ ہوں یا مدافعانہ، فتوحاتِ ملکی کے لئے ہوں یا اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے، ان تمام محاربات وفتوحات کا مقصد اور حاصل یہ نہ تھا کہ کسی کو بزورِ شمشیر اور حکومت واقتدار کے بل بوتے پر مسلمان بنایا جائے اسلام نے تو صرف اور صرف اپنی خوبیوں اور محاسن سے عالم میں رسوخ اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس نے جس تیزی کے ساتھ اقوام وملل کے اذہان وقلوب کو مسخر کیا اس طرح کی نظیر دوسرے مذاہب میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ یہ بات کہ اسلام میں کوئی زور وزبردستی نہیں ہے، اس کو ثابت کرنے کے لئے شریعت اسلام کے اصول، رسول ﷺ کے اوصاف وخصائل اخلاق حمیدہ وطریقۂ تعلیم اور پھر آپ کے بعد آپ کے صحابہ کا طرز عمل یہ ساری چیزیں تاریخ میں محفوظ ہیں۔ شریعت اسلام نے بہ زور وتخویف کسی کو مسلمان بنانے کی سخت ممانعت کی ہے قرآن کی متعدد آیات اس بات پر شاہد عدل ہیں۔

(۱) لا إکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللّٰہ فقد استمسك بالعروۃ الوثقٰی لا انفصام لھا واللّٰہ سمیع علیم. (سورہ البقرۃ ۲۵۶)

ترجمہ: زبردستی نہیں ہے دین کے معاملہ میں بے شک جدا ہوچکی ہے ہدایت گمراہی سے اب جب کوئی نہ مانے گمراہ کرنے والوں کو اور یقین لائے اللہ پر تو اس نے پکڑلیا حلقہ مضبوط جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ جانتا اور سنتا ہے۔

(۲) افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین. (یونس ۹۹)

ترجمہ: کیا تو زبردستی کرے گا لوگوں پر کہ ہوجائیں باایمان۔

(۳) ولا تسبو الذین یدعون من دون اللّٰہ فیسبو اللّٰہ عدواً بغیر علم. (الانعام ۱۰۸)

ترجمہ: اور تم لوگ برا نہ کہو ان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا بس وہ برا کہنے لگیں گے بربنائے دشمنی بغیر جانے۔

(۴) ولو شاء ربك لجعل الناس امۃ واحدۃ ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربك ولذٰلك خلقھم وتمت کلمۃ ربك لأملئن جھنم من الجنۃ والناس اجمعین. (ہود: ۱۱۸-۱۱۹)

ترجمہ: اور اگر چاہتا تیرا رب تو بنا دیتا لوگوں کو ایک جماعت اور لوگ ہمیشہ باہم اختلاف کرتے رہیں گے مگر جن پر رحم کیا تیرے رب نے اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا اور پوری ہوئی بات تیرے رب کی کہ البتہ بھردوں گا دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے اکٹھے۔

(۵) ولو شاء ربك لآمن من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ الناس حتّٰی

یکونوا مؤمنین. (یونس ۹۹)

ترجمہ: اور اگر تیرا رب چاہتا بے شک ایمان لے کر آتے جتنے لوگ کہ زمین میں ہیں سارے۔

(۶) ولو شاء اللّٰہ ما اشرکوا. (الانعام:۱۰۷)

ترجمہ: اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے۔

(۷) ان نشأ ننزل علیہم من السماء آیۃ فظلت اعناقہم لہا خاضعین. (الشعراء:۴)

ترجمہ: اگر ہم چاہیں تو اتار دیں ان پر آسمان سے ایک نشانی پھر ہو جائیں ان کی گردنیں ان کے آگے نیچی۔

(۸) انک لا تہدی من احببت ولکن اللّٰہ یہدی من یشاء وہو اعلم بالمہتدین. (القصص:۵۶)

ترجمہ: تو راہ پر نہیں لاسکتا جس کو تو چاہے لیکن اللہ راہ پر لاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے جو راہ پر آئیں گے۔

(۹) وما انت علیہم بجبار فذکر بالقرآن من یخاف وعید. (ق:۴۵)

ترجمہ: تو نہیں ہے ان پر زور کرنے والا سو تو سمجھا قرآن سے اس کو جو ڈرے میرے ڈرانے سے۔

(۱۰) فذکر انما انت مذکر لست علیہم بمصیطر. (الغاشیہ:۲۱-۲۲)

ترجمہ: سو تو سمجھائے جا تیرا کام سمجھانا ہے تو نہیں ہے ان پر مسلط۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے انسانوں کو ارادہ واختیار کی آزادی دی ہے۔ اور رد وقبول کے فیصلوں کو اس کے ہاتھوں سونپ دیا ہے۔ دین ومذاہب کے سلسلے میں وہ بالکل آزاد ہیں۔ چاہے تو قبول کر کے اپنی دنیا وآخرت کو سنواریں، اور چاہے تو انجامِ بد کے لئے تیار ہو جائیں۔ کیونکہ اسلامی ریاست کے ذریعہ ان پر زور زبردستی، طاقت وقوت اور جبر واکراہ اور حکومت واقتدار کا استعمال کر کے اپنا ہم مذہب بنانا ناجائز ہے۔ اسی لئے تمام انبیاء ورسل کو اللہ نے پیغام رساں بنایا اور انہیں حکم دیا کہ صرف میرا پیغامِ حق ان تک پہنچا دو، تم پھر اپنے فرضِ منصبی سے آزاد ہو۔ تمہارا کام صرف پیغام رسانی کا ہے۔ وہ اپنے مذہبی رسم ورواج، دین ومذہب کے افعال واعمال کی ادائیگی میں قطعی طور پر کسی کے پابند نہیں ہیں حق وباطل کا فیصلہ تو ہم کریں گے۔

لا اکراہ فی الدین کی آیت کے ذیل میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں:

”لا یتصور الاکراہ فی ان یومن احد اذ الاکراہ الزام الغیر فعلا لایرضی بہ

الفاعل وذا لایتصور الا فی افعال الجوارح واما الایمان فھو عقد القلب وانقیادہ لایوجد بالاکراہ“ (تفسیر مظہری، ج:۱،ص:۲۸۰)

کسی کے ایمان قبول کرنے کے باب میں مجبور کرنے کا تصور بھی نہیں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ مجبور کرنے کا مطلب ہے کسی کے سر ایسا کام تھوپ دیا جس کو وہ ناپسند کرتا ہے لہٰذا یہ چیز افعال وجوارح میں تو پائی جاسکتی ہے لیکن ایمان جو تصدیق قلبی اور انقیاد محض کا نام ہے دباؤ کے ساتھ نہیں پایا جاسکتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مفسر قرآن مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

”اس اصل عظیم کا اعلان کہ دین واعتقاد کے معاملے میں کسی طرح کا جبر واکراہ جائز نہیں۔ دین کی راہ دل کے اعتقاد ویقین کی راہ ہے۔ اور اعتقاد دعوت وموعظت سے پیدا ہوسکتا ہے نہ کہ جبر واکراہ سے۔ احکامِ جہاد کے بعد بھی یہ ذکر اس لئے کیا گیا تاکہ واضح ہوجائے کہ جنگ کی اجازت ظلم وتشدد کے انسداد کے لئے دی گئی ہے نہ کہ دین کی اشاعت کے لئے۔ دین کی اشاعت کا ذریعہ ایک ہی ہے اور وہ دعوت ہے۔ (مولانا ابوالکلام آزاد: ترجمان القرآن ص:۲۳۲ جلد دوم)

اس میں کچھ تردد شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اس حکم خداوندی اور عہد نامۂ رسول کی پاسداری کی ہے بلکہ ان احکامات ومعاہدات کے مطیع وفرمانبردار بن کر رہے اور ان کا پورا پورا حق ادا کیا۔ نبی کریم ﷺ اور آپ کے خلفاء راشدین نے مختلف اقوام وملل سے جو معاہدے کیے اور ان کے ساتھ جو صلح نامے تیار کئے ان میں ہمیں اسلام کی وسعت نظری کا اندازہ اور دریادلی کا ثبوت ملتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ غیر اقوام کے لوگوں نے بھی اس چیز کو تسلیم کیا ہے۔ کہ اسلام کس طرح سے غیر مذاہب کے لوگوں کا ادب واحترام محفوظ رکھتا ہے انھیں کس طرح سے مذہبی آزادی، معاشرتی وتجارتی آزادی کی چھوٹ دیتا ہے۔ بطور مثال کچھ معاہدات وصلح نامہ حوالۂ قرطاس کئے جاتے ہیں اہل نجران کی درخواست پر نبی ﷺ نے جو انہیں صلح نامہ لکھ کر دیا تھا اس کے الفاظ یہ تھے۔“

ولنجران وحاشیتھم جوار اللہ وذمۃ محمد النبی صلی اللہ علی انفسھم وملتھم، وارضھم واموالھم وغائبھم وشاھدھم وغیرھم وبعثھم وامثلتھم لا یغیر ما کانوا علیہ ولا یغیر حق من حقوقھم. (فتوح البلدان ص۷۳)

ترجمہ: نجران کے عیسائیوں اور ان کے ہمسایوں کے لئے پناہ اللہ کی اور محمد نبی ﷺ کا عہد ہے ان کے جانوں کے لئے۔ ان کے مذہب ان کی زمین، ان کے اموال، ان کے حاضر

وغائب، ان کے اونٹوں ان کے قاصدوں، اوران کے مذہبی نشانات سب کے لئے جس حالات پروہ اب تک ہیں اسی پر بحال رہیں گے۔ ان کے حقوق میں سے کوئی حق اور نشانات میں سے کوئی نشان نہ بدلا جائے گا۔

حضرت عمر نے اہل بیت المقدس کو جو صلح نامہ لکھ کر دیا تھا اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

اعطاهم امانا لانفسهم واموالهم ولكنائسهم وصلبانهم وسقيمها وبريها وسائر ملتها انه لا يسكن كنائسهم ولا تهدم ولا ينتقص منها ولا من صلبهم ولا من مثئى من اموالهم ولا يكرهون على دينهم ولا يضار احد عنهم. (تاریخ طبری فتح المقدس، ج۴، ص۱۵۹)

ترجمہ: ان کو امان دی ان کی جان و مال اوران کے کنیسوں اور صلیبوں اوران کے تندرستوں اور بیماروں کے لئے یہ امان ایلیا کی ساری ملت کے ہے۔ عہد کیا جاتا ہے کہ ان کے کنیسوں کو مسلمانوں کا مسکن نہ بنایا جائے گا اور نہ ہی ان کو منہدم کیا جائے گا۔ نہ ان کے احاطوں اوران کی عمارتوں میں کوئی کمی کی جائے گی۔ نہ ان کی صلیبوں اوران کے اموال میں سے کسی چیز کو نقصان پہنچایا جائے گا ان پر دین کے معاملے میں کوئی جبر نہ کیا جائے گا اور نہ ان میں سے کسی کو ضرر پہنچایا جائے گا۔

۱۴ھ میں فتح دمشق کا واقعہ پیش آیا حضرت خالد بن ولید نے اس موقع سے جو امان نامہ لکھ کر اہل دمشق کو دیا اس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

اعطاهم امانا على انفسهم واموالهم وكنائسهم وسور مدينتهم لا يهدم ولا يسكن شئ عن دورهم. (فتوح البلدان ص۱۲۷-۱۲۸)

ان کو امان دی ان کی جان و مال کے لئے اوران کے کنیسوں اوران کے شہر کے فصیل کے لئے ان کے مکانات میں سے نہ کوئی توڑا جائے گا اور نہ ہی مسلمانوں کا مسکن بنایا جائے گا۔

حضرت خالد بن ولید نے اہل عانات کو صلح نامہ لکھ کر دیا تھا۔

لايهدم لهم بيعة ولا كنيسة وعلى ان يضربوا نواقيسهم فى اى ساعة شاؤا من ليل او نهار الا فى اوقات الصلاة وعلى ان يخرجوا الصلبان فى ايام عيدهم. (فتوح البلدان ص۸۶)

ان کا کوئی معبد اور کوئی گرجا گھر منہدم نہ کیا جائے گا رات دن میں جس وقت چاہیں اپنے ناقوس بجائیں مگر اوقات نماز کا احترام ملحوظ رکھیں ان کو حق ہوگا کہ اپنے ایام عید میں صلیب نکالیں۔

اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ عزت واحترام کا معاملہ کیا اوران کا کتنا پاس ولحاظ رکھا۔ اگر انھوں نے اسلامی ریاست میں رہنا قبول کرلیا اوران سے عہد و پیمان ہو چکا تو۔ اب ان کی حفاظت مسلمانوں کی ذمہ داری قرار پائی۔ اب کسی طرح کی ظلم وزیادتی کا ان کو شکار نہیں بنایا

جا سکتا ہے۔اس کا اندازہ نبی کریم ﷺ کے اس فرمان مبارک سے ہوتا ہے۔

الا من ظلم معاهدًا وانتقصه او كلفهٗ فوق طاقتهٖ او اخد منه شيئاً بغير طيب نفس فانا حجيجه يوم القيامة. (ابوداؤد: حدیث نمبر ۳۰۵۲)

''خبردار جس کسی نے معاہد (غیر مسلم) پر ظلم کیا یا اس کا حق غصب کیا یا اس کی استطاعت سے زیادہ اس سے کام لیا۔اس کی رضا کے بغیر اس کی کوئی چیز لی تو بروز قیامت میں اس کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جھگڑوں گا۔ (القرطبی، الجامع لاحکام القرآن ج:۸،ص:۱۱۵)

حضرت ابوبکرؓ جس کسی لشکر کو روانہ فرماتے اس کو یہ ہدایت دیتے تھے:

ولا تهدموا بيعة ولا تقتلو الولدان ولا الشيوخ ولا النساء وستجدون اقوامًا حبسوا انفسهم فى الصوامع فدعوهم، وما حبسوا انفسهم لهٗ وستجدون آحرين اتخد الشيطان فى رؤوسهم افحاصًا فاذا وجدتم اوليك فاضربوا اعناقهم.

کسی عبادت گاہ کو مت گرانا اور نہ ہی بچوں بوڑھوں اور عورتوں کو قتل کرنا تمہیں بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جنھوں نے اپنے آپ کو گرجا گھروں میں محبوس کر رکھا ہے اور دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ان کے علاوہ تمہیں کچھ دوسرے لوگ ملیں گے جو شیطانی سوچ کے حامل ہیں جب تمہیں ایسے لوگ ملیں تو ان کی گردنیں اڑا دینا۔ (البیہقی، السنن الکبریٰ، جلد ۹،ص: ۸۵، عبدالرزاق المصنف ۵-۱۹۹)

ایک دفعہ حضرت عمرو بن عاص ولی مصر کے بیٹے نے ایک غیر مسلم کو ناحق سزا دی۔خلیفہ وقت امیر المومنین حضرت عمرؓ کے پاس جب اس کی شکایت ہوئی تو انھوں نے سر عام گورنر مصر کے بیٹے کو اس غیر مسلم مصری سے سزا دلوائی اور ساتھ ہی فرمایا تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام سمجھ لیا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔

حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کے کلیسا کے ایک گوشے میں نماز پڑھی پھر خیال آیا کہ کہیں مسلمان میری نماز کو حجت قرار دے کر عیسائیوں کو نکال نہ دیں اسلئے ایک خاص عہد نامہ لکھوا کر بطریق (پادری) کو دیا۔جس کی رو سے کلیسا کو عیسائیوں کیلئے مخصوص کر دیا گیا۔اور یہ پابندی لگا دی گئی کہ ایک ہی مسلمان کلیسا میں داخل ہوسکتا ہے اس سے زیادہ نہیں۔ (اسلامی ریاست، امین احسن اصلاحی،ص:۲۹)

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''حضرت عبداللہ بن عباس کا فتوی بھی اس لحاظ سے تھا کہ اس وقت تک مسلمان اور دوسری قومیں اچھی طرح ملی بھی نہیں تھیں۔لیکن جب یہ حالت نہیں رہی، تو وہ فیصلہ بھی نہیں رہا۔چنانچہ

خاص اسلامی شہروں میں اکثریت کے ساتھ گرجا، بت خانے، آتش کدے بنے کہ ان کا شمار نہیں ہوسکتا۔ بغداد خاص مسلمانوں کا آباد کیا ہوا شہر ہے۔ وہاں کے گرجوں کے نام مجمع البلدان میں کثرت سے ملتے ہیں۔ قاہرہ میں جو گرجے بنے وہ مسلمانوں ہی کے عہد میں بنے۔ (رسائل شبلی)

اسلام قطعی طور پر مذہب کے سلسلہ میں جبر واکراہ کو سرے سے خارج قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ اسلام صرف ظاہری وروایتی رسوم کا نام نہیں ہے بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کو اپنی دعوت وتبلیغ کا نشیمن بنانا چاہتا ہے۔ وہ انسان کے خرمن دل کو نور ایمانی سے منور کرنا چاہتا ہے۔ کیسا اسلام اسے درکار ہے کیسے دین ومذہب کا متقاضی ہے سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''اسلام کی دو حیثیت ہے ایک حیثیت میں وہ دنیا کے لئے اللہ کا قانون ہے۔ دوسری حیثیت میں وہ نیکی وتقویٰ کی جانب ایک دعوت اور پکار ہے۔ پہلی حیثیت کا منشاء دنیا میں امن قائم کرنا ہے اس کو ظالم وسرکش انسانوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچانا اور دنیا والوں کو اخلاق وانسانیت کے حدود کا پابند بنانا ہے۔ جس کے لئے قوت وطاقت کے استعمال کی ضرورت ہے لیکن دوسری حیثیت میں وہ قلوب کا تزکیہ کرنے والا ارواح کو پاک وصاف کرنے والا، حیوانی کثافتوں کو دور کرکے بنی آدم کو اعلیٰ درجہ کا انسان بنانے والا ہے۔ جس کے لئے تلوار کی دھار نہیں بلکہ ہدایت کا نور، دست وپا کا انقیاد نہیں بلکہ دلوں کا جھکاؤ اور جسموں کی پابندی نہیں بلکہ روحوں کی اسیری درکار ہے۔ اگر کوئی شخص سر پر تلوار چمکتی ہوئی دیکھ کر لا الٰہ الا اللہ کہہ دے مگر اس کا دل بدستور ماسوی اللہ کا بتکدہ بنا رہے تو دل کی تصدیق کے بغیر یہ زبان کا اقرار کسی کام کا نہیں اسلام کے لئے اس کی حلقہ بگوشی قطعاً بیکار ہے۔ (الجہاد فی الاسلام، ص:۱۶۵)

علامہ سید سلیمان ندوی اپنے مقالہ ''ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی'' میں لکھتے ہیں: ''تمام دنیا کے مذاہب میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے یہ فلسفہ دنیا میں ظاہر کیا کہ ''مذہب یقین کا نام ہے اور یقین تلوار کی دھار اور نیزہ کی نوک سے نہیں پیدا کیا جاسکتا'' (بحوالہ غیر مسلموں سے تعلقات اور مذہبی رواداری، مفتی سرور فاروقی، جمعیت پیام امن)

آپ ﷺ اور سلاطین اسلام مذہبی آزادی اور رواداری کے ایسے نقوش چھوڑ گئے جس کی مثال پیش کرنے سے دنیا کی (قدیم وجدید تاریخ) قاصر ہے غزوۂ خیبر میں جو مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا تھا اس میں توریت کے متعدد نسخے تھے۔ یہودیوں نے درخواست کی وہ ان کو عطا کردیئے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ یہ سب صحیفے ان کے حوالے کردیئے جائیں۔ یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''اس واقعہ سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان مذہبی صحیفوں کا رسول اللہ ﷺ کے دل میں کس درجہ احترام تھا۔ آپ ﷺ کی اس رواداری اور فراخ دلی کا یہودیوں پر بڑا اثر پڑا۔ وہ آپ کے اس احسان کو کبھی بھول نہیں سکتے کہ آپ نے ان کے صحیفوں کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کیا جن سے ان کی بے حرمتی لازم آتی ہو۔ اس کے بالمقابل انہیں یہ واقعہ بھی خوب یاد ہے کہ جب رومیوں سے یروشلم کو سن ۷۰ قبل مسیح میں فتح کیا تھا تو انھوں نے ان مقدس صحیفوں کو آگ لگادی اور ان کو اپنے پاؤں سے روندا۔ اسی طرح متعصب نصرانیوں نے اندلس میں یہودیوں پر مظالم کے دوران توریت کے صحیفے نذر آتش کئے یہ ہے وہ عظیم فرق جو ان فاتحین (جن کا ابھی ذکر گذرا ہے) اور اسلام کے نبی کے درمیان ہمیں نظر آتا ہے۔ (تاریخ الیہود فی بلاد العرب ص ۱۷۰) (ماخوذ رسول اللہ کی انسانیت نوازی عبدالعلیم حبیب ندوی، ادارہ احیاء علم لکھنؤ)

ایک اور فاضل مؤرخ مسٹر جیسن جو ایک بے باک تاریخ داں ہیں جنھوں نے موجودہ دور کے تمام عیسائیوں اور مسلم مؤرخوں کی تحریروں کا بہت ہی باریک بینی سے اور ناقدانہ مطالعہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

''آنحضرت ﷺ نے نہایت فراخدلی کے ساتھ اسلامی مملکت میں آباد عیسائیوں کی جان، ان کی تجارت اور ان کے مال واسباب اور مذہبی امور کی ادائیگی اور ہر قسم کے تحفظ کی ضمانت دے دی۔ اور رواداری کے اصول پر نہ صرف خلفائے راشدین ہی نے پوری سختی سے عمل کیا تھا بلکہ تمام عرب حکمراں بھی رواداری کے اس اصول پر کاربندر ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے عروج کی تاریخ رواداری، بے توجہی اور ان کے اعلیٰ قدروں کو اجاگر کرنے کی تاریخ ہے۔ اس دور کی مسلمانوں کی سلطنتیں ستم رسیدہ، یہودیوں، اور نسطوری، یعقوبی اور دوسرے عقائد رکھنے والے عیسائیوں کی پناہ گاہ تھیں اور ان کے مذہبی عقائد سے اختلاف کے باوجود مسلم مما لک میں انھیں پناہ لینے کی کھلی آزادی تھی۔ بلکہ انھیں مذہبی فرائض کی ادائیگی اور اپنی عبادت گاہوں کو تعمیر کرنے کی بھی آزادی حاصل تھی''۔ (بحوالہ اسلام اور رواداری ص: ۵۹، دعوت، دہلی ۱۳ ستمبر ۱۹۸۳ء)

ہملٹن نامی ایک انگریز سیاح جو باشاہ عالمگیر کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا وہ اپنے سفرنامے میں مختلف شہروں کا عینی مشاہدہ درج کرتے ہوئے شہر ٹھٹھ کے متعلق لکھتا ہے:

''حکومت کا مسلمہ مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے، ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طرح برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں، پوجا پاٹ کرتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانے میں مناتے تھے۔ جبکہ بادشاہت ہندوؤں کی تھی۔ (سفرنامہ ہملٹن، ج:۱ص: ۱۲۷-۱۲۸)

سر ولیم میور نے لکھا:

”رسول خدا نے بنی حارث اور نجران کے پادریوں کو پوری مذہبی آزادی دینے کا اقرار کیا تھا۔ وہ اپنے طریقے پر اپنے گرجاؤں میں جس طرح چاہیں عبادت کریں بشپ اور راہب اپنی جگہ پر بحال رہیں جب تک یہ لوگ امن و امان کے ساتھ رہیں ان کے ساتھ کچھ تعرض نہ ہوگا۔ (لائف آف محمدؐ جلد دوم ص ۲۹۹)

دین و مذہب کے سلسلے میں مسلمانوں کے ساتھ دوسری اقوام نے کیا سلوک و برتاؤ کیا، کس طرح سے انھیں مذہبی جبر و اکراہ کا شکار بنایا اس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں آج تک محفوظ ہے۔ کہ اندلس کی سرزمین پر مسلمانوں نے کئی سو سال تک حکومت کی اور وہاں کے چپہ چپہ پر اسلامی تہذیب و ثقافت کی یادگاریں قائم کیں۔ لیکن جب حکومت و اقتدار ان کے ہاتھوں سے نکل گیا اور ادبار نے ان کو آگھیرا تو عیسائیوں نے ان کے ساتھ کیسی سفاکی و درندگی کا مظاہرہ کیا۔ ایک انگریز مورخ کی زبانی سنئے وہ لکھتا ہے:

”غرناطہ کے سقوط کے بعد ان تمام عربوں کی موت تھی۔ جنھوں نے اسپین پر سات سو اکیاسی (۷۸۱) سال (۷۱۱-۱۴۹۲) تک حکومت کی، فردی ننڈ سے معاہدہ تو ضرور ہوگیا تھا۔ لیکن اس پر عمل کرنے کا اس کا مطلق ارادہ نہ تھا۔ اس نے غرناطہ پر قبضہ کرلیا۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ وہ اپنی سیاسی زندگی میں ذاتی مفاد کی خاطر ہر چیز کو قربان کرسکتا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ عربوں کو مجبور کرے گا کہ وہ اپنے مذہب اور طرز زندگی کو ترک کرکے یہاں کے باشندوں میں ضم ہوجائیں۔ وہ اپنے مذہبی قوانین میں تبدیلی اس طرح کرتا رہا کہ سارے مسلمان کیتھولک بنے رہیں۔ مسلمانوں پر عبادت کرنے کی پابندی عائد کی گئی۔ پھر وہ کھل کر اس اعلان کے ساتھ سامنے آگیا کہ وہ مسلمان جو عیسائیت قبول نہ کریں ملک بدر کردیئے جائیں۔ غرناطہ میں کہرام مچ گیا، مگر کوئی سماعت نہیں ہوئی مسلمان گرجا جاتے عیسائیوں کی طرح عبادت کرتے، مگر گھر آکر توبہ استغفار کرتے۔“ (ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ششم حصہ دوم ص ۲۵۸)

سنگدلی اور بے رحمی کی یہی تاریخ صقلیہ میں بھی دہرائی گئی۔ جہاں عربوں نے دو سو سال تک حکومت کی تھی۔ لیکن جب ۱۰۷۲ میں پلرمو کی لڑائی میں شکست ہوئی تو جس طرح مسلمانوں کو تباہ کیا وہ بھی ایک مؤرخ کی زبانی سنئے:

”پلرمو میں پانچ سو مسجدیں تھیں، ان کو منہدم کرکے گرجا گھر میں تبدیل کردیا گیا۔ وہاں علماء، صوفیا اور حکماء کی جتنی قبریں تھیں، سب نیست و نابود کردی گئیں۔ چارلس دوم کے زمانے میں سسلی کے مسلمانوں کو زبردستی عیسائیوں کا بپتسمہ دیا گیا۔ نوسیرا اور بوسیرا کے مسلمانوں کی تعداد اسّی (۸۰) ہزار

تھی ان کو زبردستی عیسائی بنالیا گیا۔ ساری جگہیں مسلمانوں سے خالی کرالی گئیں۔ (ہسٹری آف ورلڈ ۸۲/۹۰)

اسلام نے دوسرے مذاہب وادیان کے ماننے والوں کو کتنا عزت وتوقیر سے نوازا، ان کو کس طرح کی مذہبی آزادی دی اور کس طرح ان کے حقوق کا پاس ولحاظ رکھا۔ اس کے بالمقابل مسلمانوں کے ساتھ دوسرے مذاہب کے لوگوں نے کیا طریقہ کار اپنایا کس طرح سے ان کی عزت وناموس سے کھلواڑ کیا اور ان کے مذہبی حقوق کو چھین لیا۔ اور ان کو اپنا دین ومذہب ماننے پر مجبور کیا۔ ہم نے انھیں کی زبانی مندرجہ بالا سطروں میں ملاحظہ کیا ہے۔ یہ ہے وہ واضح فرق اسلام میں اور دوسرے ادیان ومذاہب میں اسلام جیسی وسعت قلبی دنیا آج تک پیش کرنے سے قاصر ہے۔

قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ اور خلفاء راشدین وسلاطین اسلام نے مذہبی آزادی کے معاملے میں جس وسعت ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے اور جتنا انھوں نے دین ومذہب کے سلسلہ میں استغنا سے کام لیا اس کی مثال اور کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ دوسرے مذہب کی تعلیمات میں اور ان کے ماننے والوں میں مذہبی امور کو انجام دینے کی اس طرح کی آزادی دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ مذہبی آزادی اسلام میں کتنی ہے اس کے ثبوت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اشاعت اسلام کے لئے کوئی کمیٹی یا کوئی ادارہ قائم نہیں کیا گیا۔ اسلامی ریاست میں یہود ونصاریٰ پوری آزادی کے ساتھ مذہبی امور کو ادا کرتے تھے ان کو بھی ملت اسلامیہ میں وہی حقوق حاصل تھے جو خود مسلمانوں کو حاصل تھے ان کے جان ومال کی وہی قدر وقیمت تھی جو ایک مسلمان کے جان ومال کی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اشاعت اسلام کے لئے اگر اس قسم کی تدبیریں کی جاتیں جو دوسرے ادیان ومذاہب کی ترویج واشاعت کیلئے اختیار کی گئی ہیں، تو بلاد اسلام میں کسی غیر مذہب یا اس کے ماننے والوں کا وجود بھی باقی نہ رہتا۔ اسلام کی ذاتی خوبیوں اور سادہ تعلیم کے ساتھ اگر سامانِ رضا ورغبت کو بھی جمع کردیا جاتا تو کیا ایک بھی ایسا انسان باقی رہ جاتا جو اسلام کو قبول نہ کرلیتا۔ کیا جس طرح ''اندلس'' (اسپین) جیسا وسیع ملک جہاں کروڑوں مسلمان تھے پھر مسلمانوں سے خالی ہوگیا۔ روم، شام، عراق، ہند وسندھ وغیرہ اور خود ''اندلس'' کا ہی حال پامال نہ ہوتا، تا آنکہ سوائے اسلام کے دوسرے مذاہب وادیان کا نام ونشان مٹ چکا ہوتا، لیکن ایسا ہرگز نہ ہوا۔

بہرحال اسلام نے مساوات اور مذہبی آزادی کے وہ فراخدل اصول وضابطے تیار کیے جن کی وجہ سے سلطنت اسلامیہ کے عروج کے زمانہ میں یہودی وعیسائی اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے ایک ساتھ رہتے تھے اور بڑے بڑے عہدے حاصل کرنے میں مسلمانوں سے مزاحمت کرتے تھے۔

❁ ❁ ❁

علماء کا معاشرے میں کردار

از: یریداحمد نعمانی

''مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے باضمیر، باعقیدہ، باایمان، باحوصلہ اور باہمت فضلاء پیدا کرے جو اس ضمیر فروشی، اصول فروشی اور اخلاق فروشی کے دور میں روشنی کے مینار کی طرح قائم رہیں کہ وہ کہیں نہیں جاتا اپنی جگہ پر کھڑا ہے، راستہ بتاتا ہے۔ جیسے ''قبلہ نما'' کہ آپ کہیں ہوں وہ آپ کو قبلہ بتادے گا۔ ہندوستان میں بتائے گا، دوسرے ملک میں بتائے گا، پہاڑ پر رکھیں تو بتائے گا، پل پر رکھیں تو بتائے گا۔ یہ ''عالم'' کا کام ہے کہ وہ ہر زمانے میں ہر جگہ ''قبلہ نما'' بنا رہے۔''

قارئین! درج بالا اقتباس مفکر اسلام ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی ایک تقریر سے اخذ کیا گیا ہے۔ شومئی اعمال جب سے ذرائع ابلاغ واعلام پر باطل قوتوں اور یہودی دماغوں کا تسلط ہوا، تب سے سچ کو جھوٹ جھوٹ کو سچ کہنے، مکروفریب کو دیانت وامانت کے پیرہن میں پیش کرنے اور نیک کو بد، بد کو نیک کے روپ میں ملفوف کرنے کا گورکھ دھندا روز افزوں ترقی پر ہے۔ اس غلط پروپیگنڈے اور تزویری ڈھنڈورے کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ''راہنمایان ملت وقوم'' کی کردارکشی اور ان کی خدمات جلیلہ ومفیدہ سے صرف نظر کرکے ان کے وجود مسعود پر انگشت نمائی کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کی نسبتی کڑیاں اور لڑیاں اس نبی آخرالزماں سے جاملتی ہیں جن کی آمد کی خبر پاکر ظلمتوں کو اجالوں کی کرن ملی۔ جو اپنے بعد نور توحید کی ضیاء پاشی کے لیے ''نفوس قدسیہ'' کی ایسی کھیپ وجماعت تیار کرگئے، جن کے علم کی قندیلوں سے قندیلیں روشن ومنور ہوتی رہیں، جن کے دم سے جہالت کی شب تاریک کے افق پر معرفت کی صبح صادق طلوع ہوتی رہی۔ ان کا وجود ہر دور میں ''انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون'' کا مظہر رہا۔

قرآن مجید کے الفاظ کی تلاوت، اس کے معنی کا فہم اور نفوس کا تزکیہ یہ وہ بنیادی اوصاف ہیں جنھیں ''کتاب حق'' نے نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کے بنیادی اور کلیدی مقاصد میں سے گردانا ہے۔ آپ کی وساطت وتوسط سے یہ ذمہ داری خیرامت کے ''راسخون فی العلم'' کے سپرد کی

گئی۔اس چشمہ صافی سے نکلنے والی تشنہ سیر نہروں نے اپنے آب شیریں سے چار دانگ عالم کو سیراب کیا۔ پیاسوں کو تشنگی کا سامان، بھٹکے ہوؤں کو منزلوں کا پتا اور ضلالت کی تاریکیوں میں شب بسر کرنے والوں کو نور ہدایت کی نوید ملی۔ ''کام'' کی اسی اہم آہنگی و یک آہنگی کی وجہ سے ''مدینۃ العلم'' ﷺ نے شہر علم وآگہی کے ''خوشہ چینیوں'' کو اپنا نائب و وارث قرار دے کرامت کے بقیہ طبقات پر ان کی فوقیت وفضیلت کی مہر استناد نقش فرمادی۔

تاریخ سے معمولی شد بد رکھنے والے فرد پر یہ امر مخفی نہیں ہے کہ خلافت بنوامیہ و بنوعباس کے عہد حکمرانی میں ہونے والی اسلامی فتوحات کا سبب جہاں محمد بن قاسم، عقبہ بن نافع، موسی بن نضیر اور طارق بن زیاد جیسے جرأت، بہادری اور غیرت ایمانی کا استعارہ بن جانے والے جرنیل بنے، وہاں ان مفتوحہ ملکوں اور علاقوں میں اسلام کو مکمل نظام حیات کے طور پر منوانے کا سہرا ان مجتہدین اور علماء ربانیین کے سر جاتا ہے، جن کی نتیجہ خیز کوششوں اور کاوشوں نے دین اسلام کی ابدی ودائمی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کی۔ ابوحنیفہ، احمد بن حنبل، مجدد الف ثانی اور شیخ الہند اسی چمنستان معرفت وآگہی کے وہ گل سرسبد تھے، جنھوں نے اپنے اپنے معاشروں اور ادوار میں پائے جانے والے عقائد ورسوم کے مابین حق وباطل، صدق وکذب اور کھرے وکھوٹے کا فرق وامتیاز لیل ونہار کے تضاد کی طرح دنیا کے سامنے آشکارا کیا۔

آپ صرف برصغیر کے ماضی پر طائرانہ نظر ڈالیں تو اس بت کدہ سرزمین پر اسلام کا پھریرا بلند کرنے والے محمد بن قاسم سے لے کر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک اور مولانا قاسم نانوتوی سے لے کر مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع تک علماء وصلحاء، مفسرین ومحدثین، مجاہدین ومبلغین اور فقہاء ومفتیین کی صورت میں ناموں اور کاموں کی ایک ایسی طویل فہرست نظر آئے گی جن کے ایمان وایقان، اخلاص وللہیت، حریت فکر اور یقین محکم کی بدولت دنیا بھر میں سینکڑوں مسلمان آج بھی دین ومذہب سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ اہل مساجد ومدارس اور ارباب خانقاہ اپنے اوپر عائد ہونے والی پیغمبرانہ نیابت کی ذمہ داریوں کا نہ صرف کما حقہ ادراک رکھتے ہیں بلکہ اپنی عملی، علمی اور فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر چراغ سے چراغ جلانے کا عمل پوری آب وتاب سے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

اس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ ''دین قیم'' کو تا صبح قیامت اس دھرتی پر قائم ودائم رہنا ہے۔اس کی نشر واشاعت، حفاظت وصیانت اور موثر دعوت کے لیے ایسے رجال کار کا ہونا ناگزیر

وضروری ہے جو معاشرے اور سماج کو شر کے اوہام باطلہ وخیالات فاسدہ کی گلن اور سڑن سے بچا کر خیر کے افکار ونظریات صحیحہ کی خوشبو اور مٹھاس سے روشناس کراسکیں۔ جو باطل کی ملمع سازی کا لباس حق کی شمشیر فاصل سے چاک کرسکیں۔ جن کے کردار میں میانہ روی، راست بازی اور صداقت شعاری کی شمع فروزاں ہو۔ امت کی چودہ سوسالہ نوشتہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ علوم وحی کے ان وارثوں اور جانشینوں نے زمان ومکان اور حالات کی ادلتی بدلتی اور الٹتی پلٹتی ہواؤں کے دوش بہ دوش چلنے کی بجائے ''قبلہ نما'' بن کر ملت کی گاڑی کو شاہراہ ہدایت کی جانب گامزن کرنے کا فریضہ مکمل استقامت وعزیمت، تندہی وجانفشانی اور ہمت وشجاعت کے ساتھ سرانجام دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے قرب قیامت کی جو علامات واخبارات بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک واضح نشانی علم کا اٹھ جانا اور گمراہی کا عام ہوجانا بھی ہے۔

عزیزان من! تھوڑی دیر کے لیے اپنی چشم بینا سے موجودہ زمانے پر نظر عمیق ڈالیے۔ دیکھئے، سوچئے اور سمجھئے... کیا یہ وہی زمانہ اور دور نہیں؟ جس کے بارے میں مخبر صادق ﷺ نے آج سے چودہ صدیاں بیشتر خبر دی تھی کہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ علم کو اپنے قبضہ میں ایسے نہیں لیں گے کہ لوگوں کے سینوں سے نکال لیں، بلکہ علماء کی موت کی صورت میں علم اٹھایا جائے گا۔ یہاں تک کہ کوئی ایک عالم باقی نہیں بچے گا۔ پھر لوگ ایسے ''سروں'' کو اپنا پیشوا اور مقتدا بنالیں گے جو نرے جاہل ہوں گے، جن سے سوال کیا جائے گا (دین کے بارے میں) تو عدم علم کی بنیاد پر فتوی دیں گے۔ پس وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔''

❁ ❁ ❁

تحریک آزادی ہند اور تحریک آزادی فلسطین دونوں میں امتیاز کیوں؟

از: ڈاکٹر اجمل فاروقی
۱۵- گاندھی روڈ، دہرہ دون

مسلمانان ہند کی نمائندہ تنظیموں کے نمائندوں اور دیگر امن پسندوں کی جانب سے مسئلہ فلسطین اور محصورین غازہ کے مسئلہ کے لئے شروع کی گئی اجتماعی جدوجہد دیر سے اُٹھایا گیا صحیح قدم ہے جو مظلوموں کی حمایت اور قبلہٴ اول کی بازیابی کیلئے ملت اسلامیہ ہند کی طرف سے فرض کفایہ ہوسکتا ہے، مگر اس تحریک کو کافی اکیڈمک ہوم ورک کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ ایک کھلا راز ہے کہ ہمارے ملک میں حکومت کے ہر شعبہ سے لے کر عوام خصوصاً میڈیا اور دانشور طبقہ میں اسرائیل، امریکی لابی کی زبردست پکڑ ہے۔ وہ اس طرح کی کسی بھی کوشش کو اسی طرح مطعون کرسکتی ہے جیسے حال کے لکھنؤ پرسنل لاء بورڈ کی قرارداد فلسطین پر حکمراں جماعت کے نامزد ایم. پی کا تھا جن کا کہنا تھا کہ خارجہ پالیسی میں ملکی مفادات کو دیکھا جائے گا کسی خاص گروہ کے احساسات وجذبات کو اولیت نہیں دی جائے گی۔ مظلومین فلسطین کی مخالفت یا اس کے حق میں رائے بنانے کے دو اصول ہوسکتے ہیں: (۱) مبنی بر مفاد (۲) مبنی بر اصول۔ مبنی بر مفاد کا مطلب یہ ہوگا کہ اسرائیل سے دوستی رکھنے میں ملک کا زیادہ فائدہ ہے یا عربوں فلسطینیوں کا ساتھ دینے میں۔ (۲) اصولوں پر مبنی رویّہ یا پالیسی کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نفع ونقصان سے اُوپر اُٹھ کر دیکھیں کہ کون حق پر ہے اور کون ظالم ہے؟

ہمارے ملک کی اسرائیلی حامی لابی جن میں مسلم دانشوروں اور اردو میڈیا بھی شامل ہے، وہ کسی بھی فلسطینی حامی مہم کا ہندوستانی میڈیا کے تعاون سے فوراً ملک مخالف مہم اور دیش بھکتی کے خلاف قرار دے گی۔ اس لابی کی تغلیط اور تردید کے لئے ہمارے پاس بہت مضبوط دلائل ہیں جن کو یکجا کر کے عوام کو آگاہ کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم مفادات کی بات کریں تو سب سے بڑی بات یہ

کہ خود سرکاری اعداد وشمار کے مطابق پورے خلیج میں تقریباً ۳۵ لاکھ ہندوستانی کام کرکے ہندوستانی معیشت اور سماج کو مضبوط کررہے ہیں جس کے نتیجہ میں سالانہ اربوں ڈالر کی بیرونی کرنسی ملک میں آرہی ہے۔ ۳۵ لاکھ کی تعداد بھارت سرکار کے کل سرکاری ملازمین کی تعداد سے تھوڑا ہی کم ہے۔ اسرائیل میں کتنے ہندوستانیوں کو روزگار ملا ہوا ہے؟ وہاں سے کتنا ڈالر ہندوستان آتا ہے؟ اکیلے سعودی عرب میں ہندوستانیوں کی تعداد پورے امریکہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ ہے۔ اور یہ لوگ بھی وہ ہیں جنہیں امریکہ اور یوروپ میں کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے یعنی بہت کم پڑھے لکھے اور کم ہنرمند افراد۔ اس کے برعکس اسرائیل ہندوستان سے صرف اور صرف ڈالر کمارہا ہے۔ پچھلے پانچ سالوں میں بیس ارب ڈالر سے زیادہ کا ہتھیار ہندوستان کو فروخت کرکے اپنی آمدنی بڑھا رہا ہے۔ اسرائیل جو بھی ہتھیار ہمیں دے رہا ہے وہ دوسرے ممالک سے بھی خریدے جاسکتے ہیں۔ ہم آج فلسطینی عوام کو دہشت گرد کہہ کر ان کا اناج، بجلی، آمد ورفت سب کچھ بند کرنے کی کیسے حمایت کرسکتے ہیں جبکہ آج سے صرف ۶۰ سال قبل ہم خود وقت کی سب سے بڑی طاقت کے خلاف سوسالہ جنگ آزادی لڑ چکے ہیں۔ ہم بھی تو مکمل خود مختاری (سوراج) سے کم کی قیمت پر نہیں تیار ہوئے تھے۔ آج ہم فلسطینیوں کی کیوں کہتے ہیں کہ وہ خیرات کی طرح ملنے والی لنگڑی لولی آزادی پر راضی ہوجائیں جس میں نہ ان کے پاس فوج ہوگی نہ سمندر اور نہ خارجہ پالیسی ہوگی۔ جس لنگڑی لولی ''ہوم رول'' پر ہم ۶۰ سال پہلے تیار نہیں تھے آج فلسطینی ویسی ہی کسی لنگڑی لولی آزادی پر کیسے تیار ہوسکتے ہیں؟

ہندوستان کی یہ برآمدات (ہر طرح کی) کا بڑا حصہ خلیجی ممالک کو جاتا ہے۔ اسرائیل ہم سے کیا خریدتا ہے؟ وہ اگر خریدنا بھی چاہے تو اس کی آبادی کتنی ہے جو وہ ہماری صنعت کے لئے مفید ثابت ہوسکتا ہے؟ پھر عربوں کے ہندوستان سے جو تاریخی رشتے ماقبل اسلام سے ہی ہیں وہ بھی اہم پہلو ہے۔ پٹرول کا معاملہ تو سب سے اہم ہے ہی۔ اس معاملہ میں ہم اسرائیل سے کتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسرائیل بھی تو مفت میں ہتھیار نہیں دیتا۔ اسی طرح عرب بھی مفت میں پٹرول کیسے دے سکتا ہے مگر وہ اس پر کوئی شرائط عائد نہیں کرتے۔ ماہرین کی رائے میں اگلے پچاس سالوں تک پٹرول کا کوئی قابل عمل متبادل نہیں ملنے والا ہے۔ پٹرول کے علاوہ دوسری ضمنی پیداوار گلسرین، گریز، تارکول اور نہ جانے کیا کیا پٹرول اشیاء کی ضمنی پیداوار ہیں یہ نیوکلیر اور گرین انرجی سے تھوڑی حاصل ہوجائے گی۔

دوسری وجہ اصولوں کی ہوسکتی ہے اوراس معاملہ میں تو اسرائیل طرزِ عمل کا ایک قدم بھی نہیں ٹھہرتا۔ ۱۹۶۷ء میں اس نے ناجائز طور پر پورے علاقہ پر قبضہ کیا۔اس کے قبضہ کے خلاف اقوام متحدہ کی سیکولر کونسل اور جنرل اسمبلی کی سیکورٹی ریزولیوشن ڈھول چاٹ رہے ہیں جبکہ عراق، افغانستان، مشرقی تیمور میں اقوام متحدہ کی صرف ایک ہی روز ولیوشن وہ بھی متنازعہ کو لے کر ایک سال سے کم عرصہ میں مخالفوں کو تہہ تیغ کردیا گیا اور یہاں ظالم اسرائیل ۴۷-۴۳ سالوں سے مسلسل فلسطینی عوام کو ان کے علاقہ سے بے دخل کرکے ناجائز بستیاں بسا رہا ہے اور امن وانصاف کے منافق علمبردار چپ بیٹھے ہیں بلکہ الٹا بے چارہ ''دشمنوں سے گھرے چھوٹے سے ملک'' کے غم میں دبلے ہوتے رہتے ہیں۔حماس جب ایک الیکشن کو جمہوری طریقہ سے جیت کر غزہ اور مغربی کنارہ پر حکومت کررہی تھی تو اس کو بے دخل کرنے والے امریکہ، اسرائیل اور ساری دنیا کیسے جمہوریت کے فروغ کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ ۱۵ لاکھ لوگوں کو مسلسل ضروریاتِ زندگی سے محروم رکھنا اور ساری نام نہاد منافق مہذب دنیا کو اس کو برداشت کرنا انسانیت اور تہذیب کے نام پر کلنک ہے۔ یہ آج کی پوری بین الاقوامی سیاسی قیادت کی مجرمانہ روش کا اظہار ہے۔اس کے خلاف جدوجہد ہر انسان پر فرض ہے۔

میرے قابلِ احترام اساتذۂ کرام

(۷)

حضرت مولانا مفتی مہدی حسن شاہ جہاں پوریؒ

صدر مفتی دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

از: مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

دارالعلوم دیوبند تمام مدارسِ اسلامیہ کا سرتاج اور اُمّ المدارس سمجھا جاتا رہا ہے۔ اور بجا طور پر وہ اس کا مستحق رہا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کا نقطۂ آغاز فقیہ النفس ابوحنیفۂ وقت حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ تھے۔ جب دارالافتاء قائم ہونے لگا تو اس دور کے سب سے بڑے فقیہ، قطبِ عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ جو دارالعلوم دیوبند کے سرپرست بھی تھے۔ ان کی نگاہِ انتخاب نے اس گوہرِ نایاب کو تاڑلیا اور سمجھ لیا کہ یہ ہیرا دارالافتاء دارالعلوم کے عظیم الشان عہدے کے لائق ہے۔

دینی منصبوں میں مفتی کا منصب سب سے اہم اور سب سے نازک منصب سمجھا گیا ہے۔ اس کے لئے جن اوصاف اور خصوصیات کی ضرورت ہے وہ بہت کم علماء میں ہوتی ہیں۔

۱۳۱۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں دارالافتاء کا آغاز ہوا۔ اور قصر افتاء کی خشت اول حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی صاحبؒ منتخب ہوئے۔ ۱۳۱۰ھ سے لے کر ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۸ء) تک ۳۶ سال ان کے قلم سے جو فتوے جاری ہوئے ان کا اندازہ کم وبیش تین لاکھ لگایا گیا ہے، جن میں ۳۷۵۶۱ کا باقاعدہ ریکارڈ موجود ہے.... یہ ہے دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کا نقطۂ آغاز۔

❁

یہ ۱۳۷۶ھ کی بات ہے، میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوا اور ابھی رمضان کی تعطیلات چل رہی تھیں کہ حضرت والد صاحب قاری جلیل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مجھے اپنے ساتھ لے کر دارالافتاء گئے۔ دارالافتاء دارالعلوم میں رمضان کی چھٹیاں نہیں ہوا کرتی تھیں اور اب بھی نہیں ہوتی ہیں۔ سالانہ چھٹیاں صرف تعلیم کے شعبوں کی ہوتی ہیں۔ بہرحال رمضان کا مہینہ تھا، میں والد صاحب کے ساتھ حاضر ہوا، اُس وقت حضرت مولانا سید مفتی مہدی حسن

صاحب دارالافتاء کے صدر مفتی تھے۔

دارالافتاء قدیم مسجد کے اوپر کی منزل پر بنا ہوا ہے۔ بڑے کشادہ کمرے ہیں۔ پہلے کمرے میں حضرت مفتی صاحب کی نشست تھی۔ ان کی رہائش بھی اسی کمرے میں تھی۔

دوسرے کمرے میں قاضی مسعود احمد دیوبندی، مفتی محمد جمیل صاحب امروہوی اور مفتی احمد علی سعید بجنوری، یہ لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ پرانے محررین میں محلّہ دیوان کے قاری اخلاق احمد اور ایک اور صاحب جو قریب کے گاؤں کے تھے، وہ تھے۔

والد صاحب نے فتاویٰ کی مشق کے لئے مجھے مفتی مہدی حسن صاحب کی شاگردی میں دیدیا۔ رمضان کے زمانے میں تقریباً نو دس بجے سے لے کر ظہر تک میں وہیں رہتا تھا اور شام کو عصر کے بعد پھر حاضر ہوجاتا تھا۔ مفتی صاحب کو کھانا پکانے کا اور افطاری بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اِملی کی چٹنی بنانے کا طریقہ انھوں نے ہمیں سکھایا۔ گویا فتاویٰ کی مشق کے ساتھ کھانے پکانے کی مشق بھی ہوتی تھی اور بقولِ حالی:

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
ایک طرفہ تماشا ہے حالی کی طبیعت بھی

مفتی صاحب بڑے بزلہ سنج پُر مذاق اور ذہین انسان تھے۔ علم ان کا بڑا مضبوط اور گہرا تھا فقہ پر پوری بصیرت کی نظر رکھتے تھے۔ مزاج میں تھوڑی تندی ضرور تھی، لیکن ان کی لیاقت میں کوئی شبہ نہ تھا۔

مفتی احمد علی سعید صاحب سے ان کی ہمیشہ نوک جھونک رہتی تھی۔ مفتی احمد علی سعید صاحب دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم مولانا مبارک علی بجنوری کے صاحبزادے تھے۔ اور مولانا مبارک علی صاحب ہمارے دادا مرحوم مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ اس لئے مفتی احمد علی سعید صاحب بھی میرے ساتھ بہت شفقت کا معاملہ فرماتے تھے۔ اور اس پرانے تعلق کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ مجموعی طور پر دارالافتاء کا ماحول بڑا خوشگوار تھا، اس لئے وہاں پڑھنے پڑھانے میں دل لگتا تھا۔

دارالافتاء کا تیسرا کمرہ لائبریری اور مطالعے کے لئے تھا۔

مفتی صاحب کی طرف سے میری ذمہ داری یہ تھی کہ آنے والی ڈاک کو چھانٹ کر ہر موضوع کے فتوے الگ الگ کروں۔ اور ان کو مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کروں۔ اور ان

کے حکم کے مطابق متعلقہ مفتی صاحبان کو وہ فتوے دوں۔ ہر فتوے کو پڑھنا میرے لئے ضروری تھا۔ کچھ فتوے مفتی صاحب الگ کرلیتے تھے کہ ان کے جواب الگ کاغذ پر لکھ کر لاؤ۔ پھر ان کی تصحیح کرتے تھے اور لکھنے کا طریقہ بتاتے تھے۔

اسی زمانے میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔ وہ یہ کہ اُس زمانے میں جماعت اِسلامی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی مخالفت بڑے زور پر تھی۔ ہمارے یہاں سے فتوے ان کے خلاف جاتے تھے۔ لوگ ان کو اشتہارات کی صورت میں چھاپ لیتے تھے، کوئی مسجد کا امام جماعتِ اسلامی سے متعلق ہوتا تھا تو اس کو مسجد سے نکال دیتے تھے۔ غرض پورے ملک میں ایک شورش برپا تھی۔

اُسی زمانے میں ردّ مودودیت کا ایک شعبہ دارالعلوم میں قائم ہوا جس کے لئے مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب پورانوڈی ہاوی کو بہار سے بلایا گیا۔ بعد میں ان کو ترتیب فتاویٰ کی خدمت سپرد ہوئی۔

مجھے اعتراف ہے کہ جماعتِ اسلامی اور ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتابوں سے میں بالکل ناواقف تھا۔ اور جب ان کے خلاف فتوے پڑھتا تھا تو مجھے خیال ہوتا تھا کہ ان کی اصل کتابیں دیکھی جائیں اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے طریقے کے مطابق کتابوں کے مصنف اور جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اگر وہ حیات ہیں تو ان سے ان کی مراد معلوم کی جائے۔

میں نے اپنے ان تاثرات کا اظہار ایک روز حضرت الاستاذ مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب سے کیا تو انھوں نے مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ اور یہ فرمایا کہ جو کتابیں ان کے خلاف لکھی گئی ہیں ان کو پڑھو۔

دارالافتاء کے لئے مجلس شوریٰ کے ممبران کی ایک کمیٹی بنی ہوئی تھی، جو دارالافتاء کے کاموں کی نگرانی کرتی تھی۔ اس کمیٹی کے ایک رُکن امیر شریعت بہار مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم بھی تھے۔ اتفاق سے اُنہیں دنوں میں مجلس شوریٰ کا اجلاس ہورہا تھا، میرے تائے ابا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب بھی شوریٰ کے ممبر تھے۔ میں ان سے ملنے گیا اور ساتھ میں مولانا منت اللہ صاحب سے بھی ملنا ہوگیا۔ تو میں نے فتووں کی اس صورت حال کے بارے میں ان سے عرض کیا۔ مولانا نے میری بات کو بڑی توجہ سے سنا اور یہ ان میں بڑی خوبی تھی کہ وہ چھوٹوں کی بات پر بھی پورا دھیان

دیتے تھے چنانچہ بعد میں جب میں پرسنل لاء بورڈ کا ممبر بنا تو مولانا کی یہ خوبی بار بار ابھر کر سامنے آتی رہی کہ بات اگر ان کے خلاف بھی ہو اور کہنے والا کتنا بھی کم رتبے کا ہو، وہ اس کی بات پر پوری توجہ فرماتے تھے۔ بہرحال مولانا نے فرمایا کہ دارالافتاء کمیٹی کی میٹنگ ہونے والی ہے اور میں یہ مسئلہ اس میں رکھوں گا۔ چنانچہ مولانا نے وعدہ کے مطابق کمیٹی کی میٹنگ میں یہ مسئلہ اٹھایا اور یہ طے ہوا کہ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو ایک سوال نامہ بھیجا جائے جس سے ان کے افکار کی وضاحت ہوسکے۔ وہ سوال نامہ تیار ہوا، مگر غالباً مفتی مہدی حسن صاحب اس کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ یہ سوال نامہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کی طرف سے بھیجا جائے۔ اس لئے یہ سوال نامہ امارات شرعیہ بہار کی طرف سے بھیجا گیا۔ وہ سوال نامہ اور اس کے جوابات مولانا ابوالاعلیٰ کی کتاب ''رسائل ومسائل'' کی چوتھی جلد میں چھپے ہوئے ہیں۔

انہیں دنوں میں حضرت مفتی صاحب کے ارشاد پر میں نے ''مَسَحُ علی الرَّقُبَة'' (گردن پر مسح) کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ مرتب کیا جس کی تصحیح خود حضرت مفتی صاحب نے فرمائی۔ یاد پڑتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ ماہنامہ تجلی دیوبند میں شائع ہوا تھا۔ لیکن اس کا مسوّدہ بعد میں کہیں گم ہوگیا اور تلاش کرنے پر بھی مل نہ سکا۔ مگر اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کا مزاج علمی اور تحقیقی تھا۔ اور طلبہ کی تربیت بھی وہ اسی انداز میں کرتے تھے۔

مفتی صاحب کا وطن شاہ جہاں پور (یوپی) تھا۔ ان کی ولادت جمادی الثانی ۱۳۰۱ھ میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے قدیم دینی مدرسہ، مدرسہ عین العلم میں حاصل کی۔ ہندوستان کے مشہور عالم اور مفتی حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ پہلے شاہ جہاں پور میں رہتے تھے۔ مفتی مہدی حسن صاحب نے ان سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اور پھر کچھ عرصہ مدرسہ امینیہ دہلی میں تعلیم حاصل کی۔

۱۳۲۸ھ میں آپ مدرسہ امینیہ سے فارغ ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۲۸ھ میں دستار بندی کا جلسہ ہوا تھا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب کے مشورے سے اس جلسے میں مفتی مہدی حسن صاحب کی بھی دستار بندی ہوئی۔

مفتی مہدی حسن صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کو حضرت شیخ الہند مولانا

محمود الحسنؒ، حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ اور حضرت شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر مکیؒ جیسے اکابر سے سندِ حدیث حاصل ہوئی۔

مفتی صاحب نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ راندیر ضلع سورت میں گذارا۔ ۱۳۳۰ھ میں مدرسہ اشرفیہ راندیر ضلع سورت، گجرات میں صدر مدرس کے طور پر آپ کا تقرر ہوا۔ اور وہاں آپ افتاء کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ مفتی صاحب کی حدیث اور اسماء الرجال پر اچھی نظر تھی۔ زندگی کے ابتدائی دور میں آپ کے غیر مقلدین کے ساتھ علمی مذاکرے بھی رہے۔ اس لئے مختلف فیہ مسائل پر آپ کو گہری بصیرت تھی۔

۱۳۶۷ھ میں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ افتاء میں صدر مفتی کے منصب پر فائز ہوئے۔ اور ۱۳۸۷ھ تک تقریباً بیس سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ۱۳۷۶ھ میں مجھے ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ اسی سال میں دارالعلوم دیوبند نے دارالافتاء میں فتاویٰ دارالعلوم کی ترتیب کا ایک شعبہ قائم کیا۔ جس کی ذمہ داری مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کے سپرد کی گئی۔ مولانا اکرم صاحب ان کے معاون تھے، وہ پاکستان چلے گئے تو ان کی جگہ پر میرا تقرر ہو گیا۔

ایک روز کی بات ہے کہ میں گردن جھکائے ہوئے اپنے کام میں مشغول تھا، میرے برابر میں مفتی جمیل صاحب کی نشست تھی، اچانک انھوں نے ایک پرچی میرے آگے رکھ دی جس میں یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

زفضلِ الٰہی بر آمد ہلال
عزیزش بدارد جلیل الجلال

میں نے پرچی دیکھی تو مفتی صاحب نے نہایت شفقت ومحبت سے فرمایا کہ تمھیں گردن جھکائے کام میں لگا دیکھ کر مجھے تمہارے دادا مرحوم یاد آ گئے۔ اور بے اختیار یہ شعر موزوں ہو گیا۔

مفتی صاحب کو شعر گوئی کا بڑا اچھا ملکہ تھا۔ اس شعر میں انھوں نے پردادا مرحوم مولانا فضل الرحمٰن، دادا مرحوم مفتی عزیز الرحمٰن، والد صاحب قاری جلیل الرحمٰن اور اس ناچیز کا نام، سب کے ناموں کو جمع کر دیا۔ اُس زمانے میں یہ بزرگانہ شفقتیں اور اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی ہمارے اکابر کا خاص مزاج رہا ہے۔

❁

بات مفتی مہدی حسن صاحب کی چل رہی تھی کہ وہ کس طرح علمی اور تحقیقی مزاج اپنے شاگردوں میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُس زمانے میں ایک بڑے مزے کا واقعہ پیش آگیا جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مفتی صاحب کو پکوان بنانے کا بڑا شوق تھا، وہ پکاتے بھی تھے اور کھلاکر خوش بھی ہوتے تھے۔ ان کا اصرار یہ رہتا تھا کہ رمضان میں افطاری میرے ساتھ کرو۔ دسترخوان پر بہت سے طلبہ اور علماء جمع ہوتے تھے اور خاصی پُرلطف مجلس ہوتی تھی۔

ایک روز ڈاک میں مجھے ایک منی آرڈر کوپن ملا، جس میں لکھا تھا کہ ہم افطاری کے لئے اتنے روپے بھیج رہے ہیں۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ مفتی صاحب یہ افطاری صدقے کی مد سے کراتے ہیں، میں افطاری کرنے سے کترانے لگا۔ اور موقع پر اِدھر اُدھر ہوجاتا تھا۔ کیوں کہ تعلیم کے پورے زمانے میں والد صاحب نے کبھی ہمیں دارالعلوم سے کسی قسم کی کوئی امداد نہیں دلوائی تھی۔ اور تنگ دستی کے باوجود بھی کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ اپنے بچوں کو زکوٰۃ، صدقات سے فائدہ پہنچائیں۔ اس لئے مزاج اسی انداز کا بنا رہا۔ ایک روز مفتی صاحب نے بہت زیادہ پکڑ کی اور پوچھا کہ تم میرے ساتھ افطار کیوں نہیں کرتے؟ تو مجبوراً میں نے کہہ دیا کہ شاید یہ افطاری صدقے کی مد سے ہوتی ہے، اس لئے میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ اس پر مفتی صاحب نے یہ یقین دلایا کہ یہ افطاری صدقے کی مد سے نہیں ہوتی، میرے اپنے ذاتی پیسے کی ہوتی ہے۔ اور جو افطاری کے لئے صدقے کے پیسے آتے ہیں وہ میں مستحق طلبہ کو دیدیتا ہوں۔

انھوں نے اس بار پر مسرت کا اظہار کیا کہ تمہارے مزاج میں یہ احتیاط ہے۔ اور اس دن سے ان کی شفقت کچھ اور زیادہ ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ استاذ کی شفقت ماں باپ کی محبت سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ یہ میری سعادت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے ایسے شفیق استاذ عطا فرمائے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مفتی صاحب کا مزاج علمی اور تحقیقی تھا۔ انھوں نے شرح کتابُ الحُجّةُ لِاَهْلِ المَدِينَةُ پر بڑی قیمتی تالیقات لکھی ہیں۔ معانی الآثار کی شرح قَلَائِدُ الْاَزْهَارُ ان کی بڑی علمی اور تحقیقی کتاب ہے۔ اَلسَّيْفُ الْمُجَلَّهُ عَلَى المُحَلَّهُ یہ عربی زبان میں ابن حزم ظاہری کے بعض حدیثی مسائل کے تبصرے پر نقد ہے۔ جو چار جلدوں میں ہے۔ حقیقت یزید اس کے علاوہ قطع الوتین یہ بھی حضرت مفتی صاحب کی تصانیف میں سے ہیں۔ افسوس ہے مفتی صاحب کی بہت سی کتابیں اس وقت دستیاب نہیں ہیں۔

عرصے تک بیمار رہنے کی وجہ سے آپ اپنے وطن منتقل ہوگئے تھے۔ آخر ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ میں وقتِ موعود آ پہنچا اور آپ اس جہانِ فانی کو چھوڑ کر مالکِ حقیقی کے حضور میں حاضر ہوگئے اُس وقت آپ کے ایک صاحبزادے مولانا محمد میاں صاحب اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ معلوم نہیں وہ بقید حیات ہیں یا نہیں؟۔ حضرت مفتی صاحب کے بیس سالہ فتاویٰ کا نایاب ذخیرہ دارالعلوم دیوبند میں موجود ہے کاش یہ فتاویٰ مرتب ہوکر شائع ہوجائیں تو ایک بڑا علمی کام ہوجائے گا۔ جو ملت کے لئے بڑا مفید ہوگا۔

مفتی مہدی حسن صاحب کے وصال کے بعد حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی اور مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمی، یہ دونوں ہی حضرات میرے سامنے ہی دارالافتاء میں تشریف لائے اور دارالافتاء کی وہ پرانی شان اور عظمت ان کے دم سے قائم رہی۔

کچھ عرصے بعد میں دارالافتاء سے درجۂ فارسی میں منتقل ہوگیا اور میرے چھوٹے بھائی مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی ایک زمانے تک نائب مفتی کے طور پر دارالافتاء میں خدمت انجام دیتے رہے۔

زمانہ کب ایک جگہ رُکتا ہے۔ انقلابات آتے رہتے ہیں۔ دارالافتاء کا سارا عملہ بدل چکا ہے۔ مفتی حضرات سب نئے ہیں اور وہ دارالافتاء جہاں برسوں شب و روز گذارے تھے اجنبی سا ہوگیا ہے۔ کبھی اُدھر کو گذرنا ہوتا ہے تو سب پرانی یادیں ٹیس بن کر ابھرنے لگتی ہیں۔

زمانہ ہوگیا گذرا تھا کوئی بزمِ انجم سے
غبارِ راہ روشن ہے بہ شکلِ کہکشاں اب تک